شوکت صدّیقی

راتوں کا شہر



ترتیب

شریف آدمی

دوسرے روز وہ بستر پر پڑا دن چڑھے تک کروٹیں بدلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ باہر صحن میں چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ ہڑبڑا کر اس نے رضائی ایک طرف پھینکی اور جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر انگڑائی لے کر کسل مندی دور کرنے لگا۔ لیکن اس مہینے کے ہر روز کی طرح، آج بھی اس کے لیے دن کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔

گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ اس نے دروازے سے جھانک کر باہر نظر ڈالی۔ اس کی بیوی دالان کے ایک گوشے میں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ تینوں بچوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ صبح ہی صبح وہ باہر میدان میں کھیلنے نکل گئے تھے۔ اس نے سوچا اس وقت بیوی سے بات کرنا مناسب نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ پہلے بچوں کو بلا کر گھر میں لے آئے اور جب ذرا چہل پہل ہو جائے تو پھر کوئی بات چیت کی جائے۔ کچھ یہی سوچ کر وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آ گیا۔ بیوی نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے دونوں کی نظریں ملیں، مگر کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ چپ چاپ گھر سے باہر چلا گیا۔

دروازے ہی پر اُسے ڈپٹی صاحب کا ڈرائیور مل گیا۔ اس وقت وہ گہرے نیلے رنگ کی اونی وردی پہنے ہوئے تھا۔ سر پہ ڈرائیوروں والی ٹوپی تھی۔ ڈرائیور ہزارے کا گورا چٹا نوجوان تھا۔ لمبا تڑنگا جسم، چہرے پر تازہ خون کی دمک، وردی پہن کر وہ بڑا شاندار نظر آ رہا تھا اور اس کے سامنے وہ خود کسی کُبڑے کی طرح حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے اُسے دیکھتے ہی اپنی بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"ماسٹر جی السلام علیکم"

وہ حقیر کبڑے سے ایک بارگی باعزت آدمی بن گیا۔ اس نے لہجے میں ضرورت سے زیادہ

شفقت پیدا کرتے ہوئے جواب دیا "وعلیکم السلام۔ کہو میاں گھر پر سب خیریت ہے۔ بال بچے اچھی طرح ہیں!"

"خدا کا شکر ہے۔ سب ٹھیک ٹھاک ہیں"

وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اُسے ڈیوٹی پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ صاحب کے دفتر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اب وہ ناشتہ سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے ہوں گے۔

ڈرائیور تیز تیز قدم اٹھاتا ڈپٹی صاحب کے بنگلے کی جانب چل دیا۔ وہ دروازے پر کھڑا اسے میدان کے اس سرے تک دیکھتا رہا جہاں بہت سے بچے ہجوم کی صورت میں چیخ چیخ کر شور مچا رہے تھے اور ذرا فاصلے پر انگریزوں کی سی وضع قطع کا ایک شخص کیمرہ لیے ان کا فوٹو لے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سارا ہنگامہ کاہے کا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اس طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں سامنے سے ریلوے ورک شاپ کا مستری آتا ہوا نظر آیا۔ وہ اسی سمت سے آ رہا تھا۔ مستری اس کا پڑوسی تھا لہٰذا شناسائی بھی تھی۔ جب وہ قریب آ گیا تو اس نے پوچھا۔

"یہ بچے اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں؟"

"میں بھی یہی دیکھنے گیا تھا" مستری نے بتایا۔ "وہ جو کیمرہ لئے کھڑا ہے، بچوں کے سامنے چاکلیٹ، ٹافیاں اور پیسے پھینک رہا ہے اور جب بچے ان کو اٹھانے کے لئے جھپٹتے ہیں تو وہ جلدی سے ان کا فوٹو کھینچ لیتا ہے۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا "فوٹو کھینچ لیتا ہے۔ کیوں؟"

مستری نے اس کی حیرت نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیا "پتہ نہیں۔ نہ جانے کیسا آدمی ہے۔ جب بچے اس کے قریب آ جاتے ہیں تو ان کو ڈانٹ کر دور کر دیتا ہے اور جب وہ چلّاتے ہیں تو کھیسیں نکال کر خود بھی ہنسنے لگتا ہے۔ میں نے بچوں کے برابر کھڑے ہو کر چاہا کہ لاؤ ایک فوٹو اپنا بھی کھنچوا لوں تو سالے نے انگریزی میں ایک موٹی سی گالی دے کر مجھے الگ ہٹا دیا۔"

اس نے جھٹ سے کہا "اور تم نے گالی سُن لی؟"

"ہاں جی اور کیا کرتا؟"

ماسٹر جی تعلیمی استعداد کے اعتبار سے تو صرف منشی فاضل تھے مگر ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی بول لیتے تھے۔ انکو مستری کی بے حسی پر بڑا تاؤ آیا۔ جی چاہا کہ ابھی جا کر اسے اس بری طرح جھاڑیں کہ

اُسے بھی معلوم ہو جائے کہ اس محلّے میں مستری کی طرح سب بے غیرت ہی نہیں رہتے بلکہ کچھ شریف لوگ بھی بستے ہیں۔ مستری جیسے ان کے ارادے کو بھانپ گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی موضوع بدل دیا۔ کہنے لگا۔

"اچھا ہوا اس وقت ملاقات ہو گئی۔ میں کئی روز سے آپ کی تلاش میں تھا۔"

"کیوں، خیریت تو ہے!"

مستری آہستہ سے بولا: "بات یہ ہے کہ۔۔۔" کہتے کہتے وہ اس طرح رُک گیا جیسے اپنی بات کہنے میں جھجک محسوس کر رہا ہو۔ اس نے مستری کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فوراً کہا۔

"ہاں، ہاں، کہو کیا بات ہے؟"

مستری کہنے لگا "بات یہ ہے جی کہ میری گھر والی پچھلے کچھ دنوں سے بہت بیمار ہے۔ اس کا تو آپ کو بھی پتہ ہو گا۔"

اس نے جھٹ لقمہ دیا۔ "ہاں! سنا تو ہے کہ تمہارے گھر میں سے آج کل علیل ہیں۔"

مستری بتانے لگا۔ "اس کی بیماری کی وجہ سے کھانے پکانے کی بڑی تکلیف ہے۔ آجکل گھر سے کچھ کھائے پیئے بغیر ہی ڈیوٹی پر چلا جاتا ہوں۔ بچے الگ ستاتے ہیں۔ گھر والی کا حال یہ ہے کہ وہ تو اٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہوتی جا رہی ہے۔ بڑی مشکل سے دن کٹ رہے ہیں۔"

اس نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "بھئی کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ اور لگ کر علاج کرو۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔"

"علاج تو اس کا ہو رہا ہے۔ مگر اس وقت سوال تو کھانے پینے کا ہے اور گھر کی دیکھ بھال کا ہے۔"

مستری نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور حرف مطلب پر آ گیا۔ "میں نے سوچا آپ کا ہاتھ آج کل ذرا تنگ ہے۔ آپ کی گھر والی، دن میں اکثر کچھ نہ کچھ مانگنے آ جاتی ہیں تو اس سے ہم دونوں کو بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔ کوئی ہرج نہ ہو تو وہ میرے گھر کی ذرا دیکھ بھال کر لیا کریں۔ کھانا تیار کر دیا کریں۔ کوئی زیادہ کام نہیں ہے۔ اپنا ہی گھر سمجھ کر کام کر دیا کریں۔ دونوں وقت کے کھانے کے علاوہ میں آپ کو پچیس روپے مہینہ دے دیا کروں گا۔ اور اس کے علاوہ۔۔۔"

مگر اس نے بات پوری کرنے سے پہلے ہی مستری کو ٹوکا۔ "اور اس کے علاوہ پھٹا پرانا کپڑا بھی پہننے کو دے دیا کروں گا۔ یہی مطلب ہے نا تمہارا۔" غصہ اور جذبات کی شدت سے اس

کی آواز بھرا گئی۔ "مستری خدا نے ہم پر یہ وقت ڈالا ہے تو تم بھی جو چاہو کہہ لو۔ اللہ اللہ! اب یہ وقت آ گیا ہے کہ ماسٹر سکندر علی کی بیوی، تمہارے گھر کے برتن مانجھے۔ ماماگیری کرے۔ واہ مستری جی! خوب تم نے ہمدردی کی۔ خوب تم نے ہمسائیگی کا حق ادا کیا۔" اس کی آواز اور بھرا گئی اور مستری کے جواب کا انتظار کئے بغیر غصّے سے کانپتے ہوئے اپنے گھر میں چلا گیا۔

مستری ہکّا بکّا کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

گھر میں داخل ہو کر ماسٹر سکندر علی نے دیکھا کہ بیوی اسی طرح دالان کے کونے میں سر جھکائے مضمحل بیٹھی تھی۔ اس نے بیوی سے اس دفعہ بھی مطلق بات چیت نہیں کی۔ کمرے میں گیا اور باؤلے کتّے کی طرح بے چینی سے ادھر ادھر تیزی سے گھومتا رہا۔

گھومتے گھومتے کمرے سے نکل کر دالان میں آ گیا اور بیوی کو مخاطب کر کے بولا۔ "میں نے کہا سن رہی ہو شبّن کی ماں۔ آئندہ اس مستری کے بچّے کے دروازے پر تم نے قدم رکھا تو سمجھ لینا مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔ خبردار جو اب تم اس کے گھر گئیں۔ سالا کمینہ بسپوڑا کہیں کا۔"

وہ پیچ و تاب کھاتا ہوا پھر کمرے کی طرف بڑھا۔ بیوی نے گھبرا کر ٹوکا۔ "خیریت تو ہے۔ آخر ہوا کیا؟"

"کچھ نہیں۔" وہ اپنی بات کہتے کہتے لحظہ بھر کیلئے رکا۔ "کیا بتاؤں۔ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ حرام زادہ، ذرا دیر پہلے باہر میدان میں ملا تو مجھ سے کہنے لگا کہ تم اپنی بیوی کو میرے گھر میں کھانا پکانے اور اوپر کے کام کاج پر لگا دو۔ پچیس روپے تنخواہ دینے کو بھی کہتا تھا۔ ذرا اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو۔ حد ہو گئی بسپوڑے پن کی۔"

بیوی غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔ غضب ناک ہو کر بولی۔ "سور کا بچّہ۔ اسے اس کی اتنی ہمت کیسے ہوئی۔ ابا جان کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو سر پیٹ لینگے۔ یہی کہیں گے۔ کہ پاکستان جا کر تم دونوں نے خاندان کا خوب نام روشن کیا۔ رئیس لسواں میر کلب رضا کی پوتی اور جتن کنور صاحب کی بیٹی اب مستریوں کے گھروں میں ماماگیری کرے گی۔ ان رذیلوں کے برتن مانجھے گی۔" اس نے اپنے سر پر دو ہتڑ مارا۔ "خدا اس گھڑی کو موت نہ دے دے۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر اپنی قسمت کو رونے لگی۔

سکندر علی کمرے میں جا کر خاموش بیٹھ گیا۔ گھر پر سناٹا چھا گیا۔ دھوپ دیوار سے پھسل کر اب

دالان تک آگئی تھی۔ گرمی کی شدت بڑھ گئی تھی۔ سکندر علی بہت اداس بیٹھا تھا۔ باہر دالان سے ابھی تک اس کی بیوی کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ فضا اتنی بوجھل اور بے کیف تھی کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اچانک گھر کا دروازہ شور کرتا ہوا تیزی سے کھل گیا۔

اسکے تینوں بچے "صحن میں آ کر آپس میں دھینگا مشتی کر رہے تھے۔ زور زور سے چیخ چلا رہے تھے۔ گھر کا سناٹا شکست ہو چکا تھا۔ زندگی کے ہنگامے اداس فضا سے نکل کر بیدار ہو گئے تھے۔ جب بچوں کا شور زیادہ بڑھ گیا تو وہ کمرے سے نکل کر دروازے پر آگیا۔ اس نے دیکھا، دونوں لڑکے چھوٹی بچی کے ہاتھ سے کچھ چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔ بچی جھکی ہوئی زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ سینے سے چپٹا لیا تھا اور دوسرے ہاتھ سے دونوں بھائیوں کو نوچ کھسوٹ رہی تھی جو بری طرح اس سے چمٹے ہوئے تھے۔

اب اس کی بیوی بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ڈپٹ کر ان کو علٰحدہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ باز نہ آئے۔ آخر وہ ان کے نزدیک چلی گئی۔ اس نے دونوں بیٹوں کو زبردستی پکڑ کر الگ ہٹایا۔ بچی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے کپڑوں پر، بالوں پر، ہاتھ پیروں پر خاک ہی خاک تھی۔ اس نے رونا بند کر دیا تھا۔ ذرا دیر بعد اس نے خوشی سے ہنس کر اپنا ہاتھ نکالا اور بھائیوں کی طرف بڑھا کر کہا: "لو یہ رہی۔" اور اپنا ہاتھ کھول دیا۔ مگر اس کا ہاتھ خالی تھا۔ لمحہ بھر تک تو وہ اپنی ہتھیلی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر منہ بسور کر رونے لگی۔ اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مٹی پر لوٹ گئی۔

دونوں لڑکے خوشی سے تالیاں بجا کر اچھلنے کودنے لگے "اچھا ہوا۔ لے چلی گئی نا۔ اب تو ہم کو بھی نہیں دیں گے" انھوں نے اپنی جیب کے اندر سے خوبصورت کاغذوں میں لپٹی ہوئی چاکلیٹ نکالی اور ماں کے پاس سے دور بھاگ گئے۔

ماں پوچھنے لگی "ارے کم بختو! یہ تو بتاؤ، اس کے ہاتھ میں تھا کیا؟"

ایک بچہ کہنے لگا "چونی تھی۔ صاحب نے ہم سب کو دی تھی۔ یہ اکیلی ہی اسے ہڑپ کر لینا چاہتی تھی، اب کھو گئی، اچھا ہوا۔"

ماں نے جلدی سے کہا "تو وہ گئی کہاں؟" اور پھر بیٹوں کی بات نظر انداز کر کے بچی کے پاس پہنچ گئی اور نظریں جھکا کر ادھر ادھر چونی تلاش کرنے لگی۔ اچانک بچی کے پیروں کے قریب اسے

مٹی میں دبی ہوئی چونی نظر آ گئی۔ اس نے چپکے سے چونی اٹھا کر ہاتھ میں دبالی۔ بچی کو اٹھایا اور چمکارنے لگی۔ وہ مٹی میں لتھڑی ہوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ سکندر علی دروازے سے لگا سب کچھ دیکھتا رہا پھر خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔

اب دوپہر ہو گئی تھی۔ کل دن بھر کی بھوک جو رات کے ہنگامے سے دب گئی تھی پھر سلگنے لگی تھی۔ سکندر علی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا کہ اب وہ کہاں جائے، کیا کرے؟ باہر دالان میں بچوں کے چلانے اور اس کی بیوی کے کوسنوں کی آوازیں سنائی پڑ رہی تھیں اور وہ ان آوازوں سے بے نیاز، صرف ایک ہی آواز سن رہا تھا۔ بھوک بھوک، بھوک جو گھڑی کے پنڈولم کی طرح کھٹاک کھٹاک کھٹاک ہر ہر پل اور ہر ہر سیکنڈ کے ساتھ ابھر رہی تھی۔

اسی لمحے اس کی بیوی کمرے کے اندر آگئی "لیجئے، یہ ذرا سے کچالو کھا کر پانی پی لیجئے۔ کچھ سہارا ہو جائے گا۔" اس نے گھوم کر دیکھا بیوی کے ہاتھ میں رکابی تھی۔ اس میں ابلے ہوئے آلوؤں کے تھوڑے سے قتلے تھے جن پر نمک مرچ چھڑکا ہوا تھا۔ اس نے بیوی سے نظریں ملائے بغیر چپ چاپ رکابی ہاتھ میں لے لی۔

بیوی باہر چلی گئی۔ اس نے آلو کا ایک قتلہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا لیکن ابھی چند ہی قتلے کھائے تھے کہ باہر آنگن میں اس کے خالہ زاد بھائی کی آواز سنائی دی۔ اس نے رکابی اٹھا کر دیوار کے پاس ایک کونے میں چھپا دی اور جلدی جلدی منہ پونچھنے لگا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ اندر آگیا۔ سکندر علی دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت عرصہ بعد آیا تھا۔ لہذا سکندر علی ہر ایک کے متعلق تفصیل سے پوچھ رہا تھا۔ آخر جب وہ اٹھ کر چلنے لگا تو سکندر علی نے تکلفاً روکتے ہوئے کہا۔

"بیٹھو میاں، چائے تو پیتے جاؤ۔"

شاید اسے ابھی کچھ دیر اور باتیں کرنا تھیں۔ لہذا وہ ٹھہر گیا۔ سکندر علی نے ذرا اونچی آواز سے بیوی کو مخاطب کیا "ارے بھئی سن رہی ہو۔ تم نے صبح کے لیے چائے تیار نہیں کی رکھے گا کہ بھائی کے یہاں گیا تھا۔ چائے تک کو نہ پوچھا" اس نے خواہ مخواہ خوش مزاج بننے کی کوشش کی۔

اسی وقت دروازے کی اوٹ سے اس کی بیوی کا چہرہ نظر آیا وہ خفگی سے آنکھیں نکالے اس کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ سکندر علی نے جلدی سے گردن موڑ لی اور پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔

آخر جب سمیع پھر اٹھنے لگا تو سکندر علی نے ٹوکا "چائے تو پیتے جاؤ۔ نہ معلوم اتنی دیر کیوں ہو گئی۔" وہ اٹھا اور باہر والان میں آگیا۔ بیوی کے قریب جا کر اس نے کہا "چائے کا تو بندوبست کر دو۔ سمیع کو تو تم جانتی ہی ہو۔ خالہ سے جا کر کہے گا۔ سکندر بھائی کے گھر گیا تھا۔ ایک پیالی چائے تک کو نہیں پوچھا۔"

بیوی جل کر بولی "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بچّی کی جوتی لے کر تو آلو منگائے تھے۔ میرے پاس کچھ آپ نے جمع کرا دیا ہے کہ چائے کا انتظام کر دوں۔"

سکندر علی خاموش ہو کر سوچنے لگا، پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا "مستری کے یہاں سے کچھ لے آؤ۔"

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی "مستری کے یہاں سے؟ آج ہی تو آپ نے منع کیا تھا۔ میں تو اس کے دَر پر اب تھوکنے کی بھی نہیں۔"

وہ اسے منانے لگا "سنو تو، کہنا ہم جلد ہی تمہارا سارا قرضہ ادا کر دیں گے اور اس میں کچھ جھوٹ بھی نہیں۔ مسلم اسکول کے سیکرٹری نے آج مجھے بلایا بھی ہے۔"

وہ آمادہ نہ ہوئی "وہ تو روز بلاتا ہے، مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔" پھر اس نے عاجزی سے کہا "خدا کے لیے مجھے وہاں نہ بھیجیے۔ بڑی شرم معلوم ہوتی ہے۔ پھر آج تو آپ سے اس کی اچھی خاصی جھائیں جھائیں بھی ہو گئی۔"

سکندر علی خاموش ہو کر انگلی سے اپنے بالوں کو کریدنے لگا۔ اتنے میں سمیع نکل کر باہر دالان میں آگیا۔ کہنے لگا "نہیں بھائی صاحب! آپ چائے کا تکلف نہ کیجیے۔ خواہ مخواہ بھابی کو تکلیف ہو گی" اور وہ روٹھا ہوا سا گھر سے باہر چلا گیا۔ سکندر علی نے اسے روکا بھی، مگر وہ نہ رکا۔ اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

سکندر علی کمرے میں واپس گیا۔ اس نے دیکھا کہ رکابی خالی پڑی تھی۔ اس کی غیر حاضری میں بچّوں نے اُسے صاف کر دیا تھا۔ غصے سے اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بچوں کو اس کا پہلے ہی علم تھا لہٰذا وہ گھر سے کھسک گئے تھے۔ اس نے جھنجلاہٹ میں رکابی اٹھا کر باہر آنگن میں پھینک دی۔ کچھ دیر غیظ و غضب کے عالم میں بیٹھا رہا، پھر اٹھا۔ اپنا ٹرنک کھولا اور کپڑوں کو الٹ پلٹ کر نیچے

سے اپنی سرج کی شیروانی نکالی۔ اسے پہنا اور تیزی سے باہر چلا گیا۔ بیوی نے اُسے باہر جاتے ہوئے دیکھا، مگر شیروانی پر نظر پڑی تو اسے تعجب ضرور ہوا۔ اس تعجب کا باعث یہ تھا کہ سکندر علی اس اُونی شیروانی کو خاص خاص موقعوں پر پہنا کرتا تھا اور اسے بڑی حفاظت سے رکھتا تھا۔ جب وہ اسے پہنتا تو بیوی کے سامنے اس طرح اترا اترا کر چلتا کہ اس کا ہر انداز چیخ چیخ کر کہتا "دیکھو کیسا سج رہا ہوں کیا ٹھاٹھ ہیں اپنے"۔ بلکہ ایک بار وہ اپنے اسکول کی کسی تقریب سے لوٹ کر آیا تو بار بار اُسے ہنسی آ رہی تھی۔ بیوی نے پوچھا تو کہنے لگا "آج بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ اسکول کے جلسے میں جو بھی آتا، وہ مجھی کو ہیڈ ماسٹر سمجھتا۔ پہلے مجھ سے ہی بڑھ کر مصافحہ کرتا۔ ہیڈ ماسٹر جل بھن کر رہ گیا۔" وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ شیروانی کی شان میں قصیدہ خوانی ہو رہی ہے۔ مگر آج اس شیروانی کو کیوں نکالا گیا! پھر اسے خود ہی خیال آگیا کہ مسلم اسکول کے سیکرٹری سے ملنے گئے ہوں گے اور اس احساس نے اسے امید اور ناامیدی کے دوراہے پر لا کر چھوڑ دیا۔

سکندر علی گھر سے نکل کر پرانے کپڑے فروخت کرنے والوں کی دکان پر پہنچا۔ آنے کو تو وہ اس بازار میں آگیا مگر کسی دکان میں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر وہ ایک دکان میں جہاں بالکل سناٹا تھا، اللہ کا نام لے کر داخل ہو گیا۔ دکان میں الماریوں کے اندر ہینگر در ہینگر، دیواروں پر ہر جگہ انگریزی وضع کے لباس ٹنگے تھے۔ بعض ایسی اچھی حالت میں تھے اور ایسے اعلیٰ درجے کے سلے ہوئے تھے کہ اُسے اپنی شیروانی گھٹیا معلوم ہونے لگی۔ دکان دار اٹھ کر اس کے پاس آیا۔

"کیا چاہیئے؟" پھر اس نے خود ہی کہا "کوٹ دکھاؤں، کوئی سوٹ؟ ہمارے یہاں جو نیا مال آیا ہے اس میں تو ایسے ایسے کوٹ ہیں کہ نیا اس کے سامنے شرما جائے۔ خالص ولایتی مال ہے۔"

سکندر علی نے جھجکتے ہوئے کہا "آپ کے یہاں شیروانیاں نہیں ہوتیں؟"

دکان دار مسکرانے لگا "نہیں صاحب! شیروانیاں کیسے ہو سکتی ہیں۔ یہ سب کپڑے تو امریکہ سے آتے ہیں۔"

سکندر کہنے لگا "شیروانی اور اسی قسم کے کپڑے آپ یہاں سے خرید لیا کیجیے۔"

دکان دار اونچی آواز میں بولا "ارے صاحب آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ امریکہ میں تو ہر سیزن میں کپڑے آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتے ہیں۔ وہاں ہر سال فیشن بدلتا ہے۔ نئے نئے کپڑے ایک

دم گندم کر دئیے جاتے ہیں۔ یہاں تو لوگ دس دس سال ایک کپڑے کو رگڑتے ہیں۔ اب اپنی اس شیروانی ہی کو دیکھ لیجئے۔ سات آٹھ سال سے کم کی کیا بنی ہوگی۔ ایسے کپڑے لے کر دکان پر لگنے جائیں تو آپ ہی بتلائیے کون ان کو خریدنے آئے گا۔"

سکندر علی جل بھن کر رہ گیا۔ اپنی شیروانی کی وہ اس قدر ہتک برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی اثنا میں دکان کے اندر ایک گاہک آگیا۔ دکان دار اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ سکندر علی پیچ و تاب کھاتا ہوا باہر آگیا۔ کسی اور دکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔

شام کو جب وہ لوٹا تو گھر میں اندھیرا پڑا تھا۔ بچے چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ بیوی حسبِ معمول ان کو کوسنے دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ جاکر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد بیوی نے آکر پوچھا: "سیکرٹری صاحب سے کچھ بات ہوئی؟"

وہ اُسے مایوس نہ کر سکا: "پرسوں پھر بلایا ہے۔"

وہ بولی: "تو کچھ امید ہے؟"

"ہاں۔ ہاں، کیوں نہیں۔" بیوی کو دلاسا دینے کے لئے اس نے نہایت صفائی سے جھوٹ بولا۔

اندھیرا اور گہرا ہو گیا تھا۔ وہ ایک بوسیدہ سرکاری کوارٹر میں رہتا تھا۔ جس کی بجلی نہ جانے کب کی کٹ چکی تھی۔

سکندر علی نے شیروانی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ بچے روتے روتے سو گئے تھے مگر سکندر علی کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا گزر نہ تھا۔ ہر طرف ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ آخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اٹھا اور کمرے سے نکل کر بے چینی سے دالان میں ٹہلنے لگا۔ گھر پر موت کی سی ویرانی چھائی تھی۔ اس نے بیوی سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آج لالٹین کیوں نہیں روشن کی۔ پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ مٹی کا تیل ختم ہو چکا ہے اور اسے خریدنے کے لئے گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔

ٹہلتے ٹہلتے اس نے کچھ سوچا۔ کمرے میں واپس گیا۔ شیروانی پہنی۔ بڑے لڑکے کو اٹھایا۔ وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ مٹی کے تیل کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھمائی اور اپنے ساتھ لے کر گھر سے باہر چلا گیا۔

بیوی نے خاموشی سے سب کچھ دیکھا مگر کچھ بولی نہیں دم بخود لیٹی رہی۔

باہر آکر وہ سیدھا محلے کے پرچونئے کی دکان پر پہنچا۔ سردی کی وجہ سے سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ دکان پر اس وقت سوائے دکان والے کے کوئی اور موجود نہ تھا۔ سکندر علی نے مسکرا کر نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"خان صاحب! تم نے ابھی تک دکان نہیں بڑھائی؟"

وہ کہنے لگا: "بس بند کرنے ہی جا رہا تھا۔ آج سردی بھی کچھ زیادہ ہے۔"

سکندر علی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی: "آج سردی کچھ چمک گئی ہے۔ مگر تمہارا کیا ہے بھائی، تم تو سنا ہے کہ آج کل بادام کا نشاستہ پیتے ہو۔" وہ خواہ مخواہ اس سے بے تکلفی برتنے لگا: "صحت بھی ماشاء اللہ ادھر اچھی ہو گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے خان صاحب! تم پر تو پھر سے جوانی آگئی ہے۔" سکندر علی یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ دکان دار بھی مسکرا دیا۔

"ماسٹر جی کیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ غریب آدمی ہوں۔ بال بچوں کا کسی نہ کسی طرح پیٹ پال لیتا ہوں۔"

سکندر علی نے جھٹ اس کی تائید کی: "ہاں بھئی تمہاری ہمت پر آفرین ہے۔ اکیلے دم پر اتنا بڑا ٹبر سنبھالے ہوئے ہو۔" پھر اس نے فوراً ہی بات کا رخ بدل کر کہا: "ذرا ایک بوتل مٹی کا تیل تو دینا۔" اور بیٹے سے بوتل لے کر اس کی طرف بڑھا دی۔ دکان دار نے بوتل میں تیل بھر دیا۔

سکندر علی نے بوتل بیٹے کو دے کر کہا: "اچھا تم چلو۔ امّی سے کہنا میں ابھی آتا ہوں۔" وہ گھر کی طرف چل دیا۔ سکندر علی دکان دار کی طرف متوجہ ہو گیا: "خاں صاحب! اس کے پیسے کل آجائیں گے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" دکان دار نے فوراً مداخلت کی۔

"ماسٹر جی اس طرح کام نہیں چلے گا۔"

وہ خواہ مخواہ ہنسنے لگا: "اماں! اس طرح بھی کام چلتا ہے۔" اس نے فوراً بات کا رخ بدلنے کی کوشش کی: "ہاں تو میں۔" دکان دار نے پھر اسے ٹوکا۔

"نہیں جی! قرض ادھار میں نے بالکل بند کر دیا ہے۔ لڑکے کو بلا لیجئے۔" اس نے سکندر علی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ لڑکے کو آواز دے کر واپس بلایا۔ اس سے بوتل لی اور کنستر میں تیل انڈیل کر خالی بوتل اس کو تھما دی۔ بچہ سہما ہوا سا باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ سکندر علی نے جھینپ مٹانے کی کوشش کی: "خان صاحب! بعض وقت تو تم ایسی بے مروتی پر اتر آتے ہو کہ بالکل مارواڑی بن جاتے ہو۔"

تمہارے پیسے لے کر یہاں سے بھاگنے سے تو رہا۔"

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تہمد سنبھالتا ہوا اٹھا اور دکان بند کرنے کی غرض سے قفل نکالنے لگا۔ سکندر علی ذرا دیر تک گم صم کھڑا رہا، پھر دکان سے ہٹ آیا۔ بیٹے کو گھر جانے کی ہدایت کی۔ خود دودھ والے کی دوکان کی طرف چل دیا۔ گھر جا کر کرتا بھی کیا۔ گھپ اندھیرے سے وحشت ہوتی تھی۔

دودھ والے کی دکان پر دھندلی سی لالٹین جل رہی تھی۔ بھٹی پر دودھ سے بھرا ہوا کڑھاؤ چڑھا تھا اور تین گاہک سامنے بنچ پر بیٹھے دودھ پی رہے تھے۔ سکندر علی بھی وہاں پہنچ گیا۔ "کہو بھئی پہلوان کیا حال احوال ہے!"

"ماسٹر جی، سب خدا کا شکر ہے۔"

"ہاں میاں، ہر حال میں اس کا شکر ادا کرنا چاہیئے وہ بڑی شان والا ہے۔"

دودھ والا اپنی بات کہہ کر فوراً کام میں مصروف ہو گیا۔ سکندر علی وہیں بنچ پر بیٹھ گیا اور بیقرار نظروں سے کڑھاؤ میں بھرے ہوئے گرم گرم دودھ کو تکنے لگا۔ جو گاہک وہاں بیٹھے تھے کچھ دیر بعد اٹھ کر چل دیئے۔ اب دکان پر سناٹا چھا گیا تھا۔ پہلوان کے علاوہ دکان میں سامنے پلنگ پر ایک شخص رضائی اوڑھے پڑا سو رہا تھا۔ ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر دکان دار کہنے لگا۔ "ماسٹر جی! اب کسی چیز میں برکت نہیں رہی۔"

وہ بولا۔ "ہاں بھئی، برکت رہے بھی تو کیسے؟ لوگوں کی اب وہ نیتیں نہیں رہیں۔ وہ ایمان نہیں رہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے جی، دنیا کا یہی حال ہے۔" پھر وہ دکان داری کے خراب ہونے کا رونا رونے لگا۔ "اب کیا بتاؤں آپ سے کہ کس طرح دکان داری چلتی ہے۔ لوگوں کو کھانے کو تو میسر نہیں۔ بے چارے دودھ کہاں سے پئیں۔"

سکندر علی نے باتوں میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ "عجیب زمانہ آیا ہے۔ ایسا تو کبھی دیکھا اور نہ خدا دکھائے۔ ایک یہ وقت ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا۔ خدا بخشے والد مرحوم حیات تھے۔ حویلی کے وسیع احاطے میں بھینسیں بندھی رہتی تھیں۔ گابھن ہوئی تو گاؤں بھجوا دی۔ دوسری بلوا لی۔ دونوں وقت میں ۲۵ سیر تک دودھ دیا ہے ہماری بھینسوں نے۔ ابا جان سر پر سوار ہو کر زبردستی دودھ پلواتے تھے جہاں

ان کی نظر بچی اور میں نے جھٹ سے کٹورا اوندھا کر دیا۔ اماں تم کو تعجب ہوگا۔ ہمارے آنگن کا فرش کچا تھا۔ جہاں میں دودھ ڈالتا تھا وہاں کی زمین ایسی چکنی ہو گئی تھی کہ نچوڑو تو چکنائی ٹپک پڑے۔"

پہلوان نے فوراً تائید کی۔ "کیوں نہیں ماسٹر جی، کیوں نہیں۔ اس دودھ کی کیا بات تھی۔"

سکندر علی جیسے اسے مرعوب کرنے پر تلا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ "سستا زمانہ تھا۔ دو روپے میں ذکر مل جاتا تھا۔ گھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو کوئی درجن بھر ملازم ہوں گے۔ پوری پلٹن کی پلٹن تھی۔ اس خیال سے کہ ابا جان ہم کو دودھ نہ پلا دیں۔ چپکے چپکے ان کو گلاس بھر بھر کر پلا دیتے تھے۔ سالے پھول پھول کر مکھنا ہاتھی ہو گئے تھے۔"

پہلوان نے اس دفعہ بات کا جواب نہیں دیا۔ ہوا یہ کہ دودھ نکالنے کا ڈونگا اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر گیا تھا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے دوسری طرف جھک گیا۔ سکندر علی کی جانب اس کی پیٹھ تھی۔ اچانک اس کی نظر لکڑی کی اس صندوقچی پر پڑ گئی جو کھلی ہوئی تھی۔ اس میں کچھ ریزگاری تھی۔ چند روپے تھے اور دس روپے والا ایک نوٹ بھی تھا۔ سکندر علی نے لمحہ بھر تک اس طرف دیکھا۔ اپنی جگہ سے اٹھا۔ بلی کی طرح چوکنا نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر جھپاک سے دس کا نوٹ اٹھا لیا۔ اسی وقت پہلوان دودھ کا ڈونگا اٹھا کر اپنی جگہ آ گیا۔ فرزند علی نے گھبرا کر نوٹ شیروانی کی نچلی جیب میں ڈال لیا اور شیروانی کی سلوٹیں درست کرتا ہوا پھر بنچ پر بیٹھ گیا۔ مگر گھبراہٹ ہنوز طاری تھی۔

دودھ والے نے اس کے چہرے کا رنگ متغیر دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا۔ "کیوں ماسٹر جی، کیا بات ہے! کچھ پریشان پریشان لگ رہے ہو۔"

سکندر علی نے خود کو سنبھالا۔ فوراً بات بنائی۔ "کچھ نہیں بھئی، بیٹھے بیٹھے پیٹ میں اچانک مروڑ سی معلوم ہوئی۔ خدا خیر کرے۔" ذرا دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

پہلوان کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ گلّے سے روپے نکال کر گننے لگا۔ روپے گنتے گنتے چونک کر بولا۔ "یہ دس کا نوٹ کہاں گیا؟"

سکندر علی اور گھبرا گیا۔ اس نے سوچا، اب یہاں سے کھسک جانا ہی بہتر ہوگا۔ اس نے اپنا خالی پیٹ خواہ مخواہ دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ "بھئی بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ میں تو اب چلا۔"

دودھ والے نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ نوٹ کے غائب ہو جانے سے وہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔

اسی اثنا میں پلنگ پر لیٹا ہوا آدمی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلوان سے پوچھا: "چاچا کیا ڈھونڈ رہے ہو؟"

"دس روپے کا ایک نوٹ جانے کہاں چلا گیا۔"

بھتیجا پلنگ پر سے اٹھ کر چچا کے پاس آگیا۔

سکندر علی اب دکان سے آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔

اس نے چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کا کندھا پکڑ کر کہا: "ذرا ادھر آنا جی۔" سکندر علی نے گھوم کر دیکھا۔ پہلوان کا بھتیجا قہر آلود نظروں سے اس کی جانب گھور رہا تھا۔

اس نے سکندر علی کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس کا نوٹ نکال کر سامنے کر دیا: "چاچا! یہ رہا نوٹ۔" وہ مسکرا کر داد طلب نگاہوں سے دودھ والے کو دیکھنے لگا۔

ہوا یہ کہ گھبراہٹ میں سکندر علی نے نوٹ اس طرح رکھا تھا کہ جیب سے اس کا ایک کونا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ دکان دار ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ غضب ناک ہو کر دکان سے نیچے کودا۔ تیزی سے سکندر علی کی جانب لپکا اور قریب پہنچ کر سکندر علی کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ مگر فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کپڑے جھاڑنے لگا۔ اس کی آواز اس قدر بھرائی ہوئی تھی کہ منہ سے بول نہیں پھوٹ رہا تھا۔ لیکن پہلوان نے ایک لات مارنے پر اکتفا نہیں کیا۔ جھپٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور گالیاں دینے لگا۔

سکندر علی نے آہستہ سے کہا: "اماں گریبان تو چھوڑ دو۔ دم گھٹا جا رہا ہے۔"

پہلوان نے اس کے منہ پر کس کے تھپڑ مارا۔ چیخ کر بولا: "حرام کے تخم! شرم نہیں آتی چوری کرتے ہوئے؟"

سکندر علی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا: "اچھا گریبان تو چھوڑو، میری سرج کی شیروانی کا کالر خراب ہو جائے گا۔"

دودھ والے نے اس زور کا جھٹکا دیا کہ شیروانی کندھے پر سے پھٹ کر کمر تک آگئی اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھر اسے مارنا شروع کر دیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا۔

"سالے چرایا مال گر تیرا ابھر کس نکال دوں گا۔ تو اسی لیے اتنی رات کو دکان پر آیا تھا۔"

سکندر علی آہستہ آہستہ بول رہا تھا: "تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو؟ تمھارا نوٹ مل گیا۔ اب مجھے چھوڑ دو۔ تم نے مارنا تھا مار بھی لیا۔ اب اور کیا چاہتے ہو۔"

مگر پہلوان ذرا متاثر نہ ہوا۔ کہنے لگا: "میں تجھے تھانے لے جاؤں گا۔ سالے تجھ کو یونہی تھوڑی چھوڑوں گا۔"

شور سن کر پاس پڑوس کے رہنے والے گھروں سے نکل نکل کر وہاں اکٹھا ہونے لگے۔ پہلوان نے اب سکندر علی کی قمیص کا گریبان پکڑ لیا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا: "بھئی میری بات تو سنو۔" اتنے میں ایک شخص بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھا۔ اسے سکندر علی کی ناگفتہ بہ حالت پر ترس آگیا۔ اس نے پہلوان سے ڈپٹ کر کہا۔

"گریبان تو چھوڑ دو۔"

پہلوان نے گریبان چھوڑ دیا۔ اس نے سکندر علی کو شائستگی سے مخاطب کیا: "ماسٹر صاحب پہلے آپ بتائیے کہ بات کیا تھی؟"

سکندر علی کو ذرا سہارا ملا تو اس نے خود کو سنبھالا۔ ڈھٹائی سے بولا: "جناب میں شریف آدمی ہوں۔ یہ بدقماش لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مجھ پر چوری کا الزام لگا رہے ہیں۔ دیکھئے میری اتنی قیمتی شیروانی بھی پھاڑ ڈالی اور برابر مار پیٹ رہے ہیں۔" وہ بھیگی بلی بنا ہوا رقت انگیز لہجے میں صفائی پیش کر رہا تھا: "خدا کی قسم میں نے اس کا نوٹ دیکھا تک نہیں۔"

پہلوان کا بھتیجا غضبناک ہو کر چیخا: "او سور کے بچے، جھوٹے۔ ابھی تو تیری جیب سے میں نے چوری کا نوٹ نکالا ہے۔"

سکندر علی کے جھوٹ بولنے پر پہلوان کو پھر غصہ آگیا۔ وہ اسے موٹی موٹی گالیاں دینے لگا۔ اس نے جھپٹ کر ایک بار پھر اس کا گریبان پکڑ لیا اور سکندر علی کے حمایتی کی طرف آنکھیں نکال کر بولا: "دیکھئے بابو جی آپ اس معاملے میں نہ بولیئے ورنہ بات بڑھ جائے گی۔"

بے چارے بابو جی پہلوان کی خون خوار آنکھوں سے مرعوب ہو گئے۔ وہ بات کو آگے نہ بڑھا سکے اور آہستہ سے کھسک کر پیچھے آ گئے۔ پہلوان بضد تھا کہ وہ سکندر علی کو تھانے ضرور لے جائے گا۔

اسی اثنا میں کسی نے ہجوم میں سے چیخ کر کہا ۔

" پہلوان تھانے لے جا کر کیا کرو گے ۔ خواہ مخواہ رات کی نیند حرام کرو گے ۔ عدالت میں پیشیاں الگ بھگتنا پڑیں گی ۔ میرا کہا مانو تو دس بیس جوتے مار کر چھوڑ دو ۔ سالا بال بچے والا ہے ، یہ تو جیل چلا جائے گا ۔ وہ بلے چارے بھوکے مریں گے ۔"

پہلوان اس تجویز کو قبول کرنے میں ہچکچا رہا تھا ۔ اتنے میں اسی شخص نے ، جس نے یہ مشورہ دیا تھا ، پیر سے جوتا اتارا اور دھڑا دھڑ جوتے مارنا شروع کر دیئے ۔

سکندر علی چیختا رہا ۔ دہائی دیتا رہا " بھائی ، میری بات تو سنو ۔ میں شریف آدمی ہوں ۔" مگر وہاں کون اس کی سنتا ۔ وہ قسمیں کھاتا رہا ۔ اپنی بے گناہی ثابت کرتا رہا ۔ مگر جوتے دھڑا دھڑ پڑتے رہے ۔ پھر اس شخص نے ہاتھ روک کر ہانپتے ہوئے کہا " اچھا اب اس کو جانے دو ۔" اور وہ سکندر علی کا ہاتھ پکڑ کر بھیڑ سے باہر نکال لایا اور جھک کر سرگوشی کی ۔

" کہو استاد کیسا صاف بچوا دیا ۔ ورنہ ابھی حوالات میں ہوتے ۔ تم شریف آدمی ہو ۔ اسی کو غنیمت جانو ۔"

سکندر علی کو اس پر سخت غصہ آیا ۔ مگر وہ کرتا بھی کیا ۔ چپ چاپ شریف آدمی کی طرح سر جھکائے آگے بڑھ گیا ۔

گھر میں جا کر اس نے دیکھا ۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اور بیوی جاگ رہی تھی ۔ اس کی پھٹی ہوئی شیروانی اور بگڑا ہوا حلیہ دیکھ کر بولی " یہ ہے ہے کیا ہو گیا ۔ کسی سے لڑ کر آئے ہو ؟ شور تو میں نے بھی سنا تھا ۔"

وہ خشم گیں نظروں سے گھور کر بولا " کچھ نہیں ہوا ۔"

وہ پریشان ہو کر اصرار کرنے لگی " کچھ تو بتاؤ ۔ ہوا کیا ؟"

وہ بگڑ کر بولا " یہ روشنی کمرے میں کیسی ہو رہی ہے ؟ تم پھر اس خبیث مستری کے یہاں گئی تھیں ۔ میں نے ہزار دفعہ سمجھایا کہ وہاں نہ جایا کرو ۔ مگر تم تو ذات کی میراثن ہو میراثن ۔ کمین خصلت کہیں جا سکتی ہے ۔"

وہ سراسیمہ ہو کر عاجزی سے بولی " اس کے یہاں کب گئی تھی ۔ آپ کے جانے کے بعد یہ

بچے سب جاگ اٹھے تھے ۔ ان کو بہلانے کے لیے کلب کی طرف لے گئی تھی ۔ وہاں آج کوئی بڑا جشن تھا ۔ بہت بھاری دعوت تھی ۔ خوب روشنی ہو رہی تھی ۔ بینڈ بج رہا تھا ۔ عورتیں اور مرد مل کر ناچ رہے تھے ۔" وہ بچوں کی طرح ایک ایک بات تفصیل سے مزا لے لے کر بتا رہی تھی " وہیں کوڑے کے ڈرم میں سے بچے نہ جانے کیسے ایک موم بتی ڈھونڈ لائے ۔ اسی کو میں نے جلا دیا ۔" سکندر علی خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا ۔ دفعتاً اس نے فرش پر پڑے ہوئے توسٹ کے ایک ٹکڑے کو دیکھا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا ۔

" اور وہیں کوڑے کے ڈھیر سے ، لوگوں کے آگے کا بچا کھچا کھانا بھی اٹھا لائیں ۔ میں کہتا ہوں ، تم کیوں میری عزت کے پیچھے پڑی ہو ۔ دنیا میں ایسی بھی عورتیں ہیں جن پر سات سات وقت کا فاقہ پڑتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور ایک تم ہو ۔"

بیوی کی چوری پکڑی گئی تھی ۔ وہ جھنجھلا کر بولی " آخر میں کیا کروں ۔ ان حرام زادوں نے میری بوٹیاں نوچنی شروع کر دی تھیں ۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر زور زور سے رونے لگی ۔

سکندر علی کو اس کا رونا پیٹنا سخت ناگوار گزرا ۔ وہ غضب ناک ہو کر بیوی پر جھپٹا اور اس کے بال پکڑ کر اس زور سے کھینچے کہ وہ فرش پر منہ کے بل گر پڑی ۔ سکندر علی اس وقت واقعی دیوانہ ہو گیا تھا ۔ اس نے بیوی کی کمر پر اور پیٹھ پر جوتوں کی ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں ۔

شور سن کر بچے بھی جاگ اٹھے ۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگے ۔ سکندر علی نے چیخ کر انہیں ڈانٹا ۔ " چپ ہو جاؤ ، سور کے بچو ۔" مگر دو سور کے بچے تو ڈانٹ سن کر خاموش ہو گئے ۔ البتہ سور کی بچی اور چیخ چیخ کر رونے لگی ۔ سکندر علی نے جھنجھلا کر اس کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑھکتی ہوئی بستر کے دوسرے کنارے تک چلی گئی اور خوف زدہ ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی ۔

سکندر علی لمحہ بھر تک سہمی ہوئی معصوم بچی کی جانب گھورتا رہا ۔ پھر اسے خود ہی اپنی حالت پر ترس آ گیا ۔ وہ وحشیوں کی طرح پلٹا اور دیوار پر سر دے مارا ۔" اور لو اور لو ، اور لو ۔" وہ دیوانوں کی طرح دیوار پر ٹکریں مارتا رہا ۔ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہتا ہوا اس کے چہرے پر پھیل گیا ۔

دھندلی روشنی میں خون سے لتھڑا ہوا اس کا چہرہ بہت خوف ناک نظر آ رہا تھا ۔ بچے چیخ کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے تھے ۔ لیکن سکندر علی زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا ۔ اس کے پیر کانپنے لگے

تھے۔ وہ نڈھال ہو کر لڑکھڑایا اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

بہت دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا اور اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس نے سر پہ ہاتھ پھیرا تو محسوس ہوا کہ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی تھی۔ وہ دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ اس کا ذہن ہر خیال سے خالی ہو چکا تھا اور پیٹ میں آگ سی لگ رہی تھی۔

وہ آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اندھیرے میں ہر طرف نظریں دوڑائیں۔ مگر سوائے اس کے کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ سب سو رہے ہیں۔ وہ کمرے سے نکلا اور چپ چاپ گھر سے باہر چلا گیا۔

کلب میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔

کلب کے پچھواڑے دیوار کے سائے میں چند کتے موجود تھے۔ وہ غرا رہے تھے۔ آپس میں لڑ رہے تھے۔ سکندر علی آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ کتے اسے دیکھ کر غرائے۔ بھونکے بھی اور پھر وہاں سے بھاگ گئے۔

اس کے چاروں طرف طرح طرح کے کھانوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کئی بار گہری سانس بھری۔ کھانوں کی خوشبو کی لذت کو محسوس کیا۔ چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ زیر لب مسکرا کر سوچا، بھلا اتنی رات گئے یہاں کون آنے لگا۔ اس نے جھک کر روٹی اور گوشت کے کچھ بچے کھچے ٹکڑے کوڑے کے ڈھیر میں سے ڈھونڈ کر نکالے اور وہیں بیٹھ کر ہبڑ ہبڑ کھانے لگا۔

اچانک کوڑے کے بڑے ڈرم کے عقب سے ایک انسانی سایہ ابھرا۔ اچانک گھٹی ہوئی نسوانی چیخ سنائی دی۔ وہ اس طرف بڑھا۔ قریب جا کر دیکھا۔ یہ اس کی بیوی تھی۔ دونوں لمحہ بھر تک ہکا بکا کھڑے رہے۔ پھر سکندر علی نے مسکرا کر ایک ٹکڑا بیوی کی طرف بڑھایا۔ آہستہ سے کہا۔

"لو اسے کھاؤ۔ بہت مزیدار ہے۔" بیوی نے چپ چاپ ہاتھ بڑھا کر اسے لے لیا۔

تماشائے اہلِ کرم

سڑک کے ایک موڑ سے اچانک کتوں کا غول نمودار ہوا۔ کتے کار کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے اور زور زور سے بھونک بھی رہے تھے۔ سلیم احمد خاں درانی نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا اور جھنجھلا کر بڑبڑانے لگا۔ سامنے نظر ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا۔ ایک سایہ کار کی بتیوں کی تیز روشنی میں لہرایا۔ درانی نے گھبرا کر بریک لگانے کی کوشش کی۔ اندھیرے میں ایک ہولناک چیخ ابھری۔ کار زور سے اچھلی اور بے قابو ہو کر سڑک کے کنارے لگے ہوئے ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹکرا کر رک گئی۔

حادثہ اس قدر آناً فاناً ہوا کہ درانی دم بخود رہ گیا۔ چند لمحے تک ہکا بکا سا اسٹیئرنگ وہیل کے سہارے بت بنا بیٹھا رہا، پھر ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو وہ سنبھلا۔ خیریت ہوئی کہ جسم پر کہیں چوٹ چپیٹ نہیں آئی تھی۔ وہ بالکل محفوظ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور کار سے نکل کر باہر آ گیا۔

اس نے بدحواس ہو کر دیکھا۔ سڑک کے بیچوں بیچ کوئی اندھیرے میں بے حال پڑا تھا اور رک رک کر کراہ رہا تھا۔ درانی نے اس کی کراہ سنی۔ دم بھر کے لئے ٹھٹکا، پھر آہستہ، آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔ تاروں کی دھندلی دھندلی روشنی میں درانی نے غور سے دیکھا۔ ایک لمبا چوڑا آدمی اوندھے منہ سڑک پر لیٹا تھا۔ اس کے آس پاس خون ہی خون پھیلا تھا۔ دور دور تک کسی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور گہری خاموشی چھائی تھی۔

درانی نے چوکنّا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ جھکا اور سڑک پر پڑے ہوئے زخمی

شخص کے بازوؤں کو دونوں ہاتھوں سے تھاما۔ اپنی طرف کھینچا اور اسے گھسیٹتا ہوا کسی نہ کسی طور سڑک کے کنارے لے گیا۔ اس نے اب کراہنا بند کر دیا تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ درانی نے اس کی یہ حالت دیکھی تو پریشان ہو گیا۔ موقع غنیمت تھا۔ اس نے فرار ہونے کا منصوبہ باندھا۔ زخمی کو اس کے حال پر چھوڑا۔ کار کی سمت بڑھا اور اندر جا کر اسے دوڑانے کی کوشش کی۔ مگر انجن اسٹارٹ نہ ہوا۔

ہر طرح کی کوشش کے باوجود جب انجن اسٹارٹ نہ ہوا اور کار ٹس سے مس نہ ہوئی تو مجبوراً وہ پھر باہر آ گیا۔ سہما ہوا سا خون میں ڈوبے ہوئے آدمی کے پاس گیا۔ وہ اب تک بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ درانی خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب کیا، کیا جائے۔ کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ کار چھوڑ کر بھاگ جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ جائے واردات پر کار کی موجودگی اس کے خلاف پورا پورا ثبوت بہم پہنچا سکتی تھی۔

درانی کی پریشانی اور گھبراہٹ دم بدم بڑھتی جا رہی تھی۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ آس پاس آبادی بھی نہ تھی۔ سڑک کے دونوں جانب بنجر اور چٹیل میدان تھا۔ جس میں کہیں کہیں خود رو اور جنگلی پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ درانی کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ گم صم کھڑا تھا۔ کئی منٹ اسی گومگو کے عالم میں گزر گئے۔ ناگاہ، دور سے روشنی ابھری اور سڑک پر پھیلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ٹرک سامنے سے نمودار ہوا اور رفتہ رفتہ قریب آ گیا۔ درانی نے اپنے حواس درست کئے۔ آگے بڑھا اور ہاتھ ہلا ہلا کر ٹرک ٹھہرانے کی کوشش کی۔ ٹرک نزدیک پہنچ کر رک گیا۔

درانی نے اونچی آواز سے کہا۔ "ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

ٹرک کے اندر ڈرائیور کے علاوہ کلینر بھی موجود تھا۔ دونوں نے جھک کر باہر دیکھا۔ ان کے سامنے خون میں لتھڑا ہوا ایک کالا کلوٹا آدمی مردے کی مانند بے حال پڑا تھا۔ قریب ہی درانی کی کار کھڑی تھی۔ جس کا بونٹ ٹیلی فون کے کھمبے سے ٹکرا کر ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ کھمبا بھی کار کی ٹکر سے ایک طرف جھک گیا تھا۔

"زبردست ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔" ڈرائیور نے زخمی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے

دریافت کیا۔ "کیا ایک دم سامنے آگیا تھا؟"

"باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے"۔ درانی نے مڑ کر زخمی کو دیکھا جو ٹرک کی بتیوں کی تیز روشنی میں بے جان نظر آرہا تھا۔ "اسے فوراً اسپتال پہنچانا ہے۔"

"معاف کرنا جی، میں ایسے چکر میں نہیں پڑتا"۔ ڈرائیور نے بے رخی سے جواب دیا۔

درانی نے عاجزی سے کہا۔ "یہ ایک زندگی کا سوال ہے۔ اسے فوری طور پر طبی امداد نہ ملی تو ختم ہو جائے گا۔"

"یہ تو اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں مر جائے گا۔ اس کی حالت دیکھ کر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔" ڈرائیور اسپتال جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ "مر گیا تو تمہارے ساتھ میں بھی پھنس جاؤں گا۔ گواہی دو۔ ہر پیشی پر عدالت میں حاضری لگواؤ۔ نہ جاؤ تو گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو جاتا ہے۔"

"پولس الگ پریشان کرے گی۔ کبھی تھانے جاؤ، کبھی عدالت۔" اس دفعہ کلینر بولا۔

اس نے حوصلہ افزائی کے بجائے حوصلہ شکنی کی۔ اس نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ "استاد! گاڑی اسٹارٹ کرو۔ اس چکر میں نہ پڑو۔ یاد ہے نہر کے پل والا ایکسیڈنٹ۔ عدالت کے چکر کاٹتے کاٹتے کتنی پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ سارا دھندا چوپٹ ہو گیا تھا۔"

"تو گویا تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔" درانی نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

"میں تمہاری یہ مدد کر سکتا ہوں کہ تھانے پہنچا دوں۔" ڈرائیور نے مشورہ دیا۔ "تھانہ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں۔ راستے ہی میں پڑے گا۔ میں تم کو وہاں چھوڑ دوں گا۔"

"مگر میں تھانے جا کر کیا کروں گا؟" درانی نے حیرت سے پوچھا۔

"لگتا ہے پہلی بار تمہارا ایکسیڈنٹ سے سابقہ پڑا ہے۔" ڈرائیور نے مسکرا کر کہا۔ "میری گاڑی سے تو جب بھی ایکسیڈنٹ ہوتا ہے۔ گاڑی چھوڑ کر سیدھا تھانے جاتا ہوں۔ تھانے ہی میں معاملہ فٹ ہو جائے تو عام طور پر عدالت جانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ساری کارروائی تو پولیس ہی کو کرنی ہوتی ہے نا۔ میرا کہنا مانو تو تھانے چلے جاؤ۔ دیوان جی سے اپنی جان پہچان بھی ہے۔ اس وقت ڈیوٹی پر ہوئے تو معاملہ طے کرا دوں گا۔"

درانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحے گم سم کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے ڈرائیور کا مشورہ قبول کر لیا۔ اس کے ہمراہ تھانے جانے پر آمادہ ہو گیا۔ ٹرک کے اندر داخل ہوا اور ڈرائیور کے قریب بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے ایکسیلیٹر دبایا۔ ٹرک آگے بڑھا اور سنسان سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگا۔

درانی چلا گیا۔ مگر زخمی سڑک کے کنارے بیہوش پڑا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک کار اس کے نزدیک آکر رکی۔ دروازہ کھلا اور ایک شخص کار سے نکل کر باہر آیا۔ اتفاق سے وہ ڈاکٹر تھا۔ نوجوان اور صحت مند تھا۔ خدا ترس بھی تھا۔ اس نے زخمی کو اٹھا کر اپنی کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا اور سرکاری اسپتال کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسپتال پہنچ کر اس نے زخمی کو شعبہ حادثات کے ڈاکٹروں کے سپرد کر دیا۔

☆

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ درانی نے تھانے میں پہنچ کر کس ڈھب سے بات کی۔ ٹرک ڈرائیور کے وسیلے سے کیوں کر اپنی گلو خلاصی کرائی اور پولس نے ضابطہ کی کارروائی کس طور مکمل کی۔ تھانے کے ہیڈ محرر نے روزنامچے میں کیا رپورٹ درج کی۔ البتہ مقامی اخبارات میں حادثے کے متعلق جو خبریں شائع ہوئیں، ان سے اتنا معلوم ہو سکا کہ زخمی کا نام عبداللہ تھا۔ رکشا چلاتا تھا۔ حادثہ کی شب مالک کو رکشا واپس کر کے گھر لوٹ رہا تھا۔ نکلسن روڈ کے موڑ پر ایک تیز رفتار کار کی زد میں آگیا تھا۔ زخم ایسا کاری لگا کہ فوراً بیہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔

عبداللہ، الگ بھگ دو مہینے تک اسپتال کے جنرل وارڈ میں زیر علاج رہا۔ جس روز اسپتال سے چھٹی ملی تو صرف اس کی بیوی موجود تھی، وہ اسے گھر لے گئی۔ حادثے میں جو زخم آئے تھے وہ تو علاج معالجے سے مندمل ہو گئے، لیکن پیر کی ہڈی ایسی چکنا چور ہو گئی کہ درست نہ ہو سکی۔ ڈاکٹروں نے مجبوراً اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی۔

عبداللہ اب کسی کام دھندے کے لائق نہیں رہا تھا۔ ایک ٹانگ سے محروم ہونے کے بعد وہ بیساکھی کے سہارے چلتا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا مضبوط جسم مرجھا کر کبڑوں کی مانند جھک گیا تھا۔ وہ تمام وقت گھر میں پڑا کھانستا رہتا۔ آل اولاد بھی نہ تھی۔ لے دے کے گھر میں صرف ایک

بیوی تھی جو اس کی مونس و غم گسار بھی تھی اور اس کے غم و غصے کا نشانہ بھی بنتی تھی۔ وہ بہت چڑچڑا اور زود رنج ہو گیا تھا۔ بات بات پر بیوی سے لڑتا جھگڑتا۔ مارنے پیٹنے کی دھمکی بھی دیتا۔ اس کا سیاہ رنگ کچھ اور زیادہ سیاہ ہو گیا تھا۔ ڈاڑھی بڑھ کر بے ترتیب ہو گئی تھی۔ آنکھوں سے ہر وقت وحشت برستی۔ چہرہ روز بروز خوف ناک ہوتا جا رہا تھا۔ ملنے جلنے والے، جو از راہ ہمدردی کبھی کبھار اس کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ جاتے تھے، اب کترانے لگے تھے۔

عبداللہ جس محلہ میں رہتا تھا، اس کی بیشتر آبادی غریب اور پس ماندہ طبقے کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ محلے میں ہر طرف چھوٹے چھوٹے نیم پختہ مکانات تھے۔ چند قدیم وضع کی بلند و بالا عمارتیں بھی تھیں جو امتداد زمانہ سے روز بروز کھنڈر بنتی جا رہی تھیں۔ تنگ و تاریک گلیاں تھیں جن کے درمیان انگریزوں کا ایک قبرستان بھی تھا۔ قبرستان کے چاروں طرف قد آدم پختہ چار دیواری تھی، وسط میں ایک اونچی لاٹ تھی جس پر سنگ مرمر کا کتبہ آویزاں تھا۔ یہ کسی انگریز کرنل کی قبر تھی جس کی تمام زندگی میدان جنگ میں غنیم سے معرکہ آرائی میں بسر ہوئی تھی۔ لیکن اس کی موت خود کشی سے واقع ہوئی تھی۔

محلے بھر میں مشہور تھا کہ مرنے کے بعد کرنل بھوت بن گیا تھا۔ اکثر سنسان راتوں میں لوگوں نے اُسے گلیوں میں منڈلاتے ہوئے دیکھا بھی تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ جب کبھی وہ کسی کو نظر آیا، تو ہمیشہ ایک ہی صدا لگاتا "مکھن توش"۔ خدا معلوم اس کی اس طلب کا کیا مطلب تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ جس کسی سے بھی مڈھ بھیڑ ہوئی اس نے یہی آواز اس کے منہ سے سنی اور یہ آواز اس قدر ڈراؤنی ہوتی کہ اچھے بھلے جی دار آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے اور وہ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگتا۔ یہی وجہ تھی کہ قبرستان کی چار دیواری کے ساتھ جو پتلی سی گلی جاتی تھی، رات گئے راہ گیر اس سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

☆

محلے کی دوسری نمایاں خصوصیت سکینہ بیگم تھیں۔ وہ بیوہ تھیں اور ان کے شوہر ترکے میں بہت بڑی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے۔ مرحوم کی جیتی جاگتی نشانی صرف ایک بیٹا تھا۔ سکینہ بیگم نے اُسے بڑے ناز و نعمت سے پالا تھا۔ اسے دیکھ کر جیتی تھیں۔ ہر طرح سے ناز برداری کرتی تھیں۔ مگر وہ پوری طرح جوان بھی نہ ہوا تھا کہ گھر سے روٹھ کر چلا گیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے ماں

سے کھچڑی کھانے کی فرمائش کی تھی۔ سکینہ بیگم کی اس روز طبیعت کچھ ناساز تھی۔ باورچی نے توجّہ نہ دی۔ دسترخواں پر کھچڑی نہ پاکر صاحب زادے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ بغیر کچھ کھائے پیئے دسترخوان سے اٹھ گئے۔ اس کے بعد اُسے کسی نے نہ دیکھا۔ البتہ کچھ عرصے بعد یہ اطلاع ملی کہ وہ ٹرین کے حادثہ میں جاں بحق ہو گیا۔ حادثہ کے کئی عینی گواہ تھے۔ انھوں نے سکینہ بیگم کو اس الم ناک سانحہ سے آگاہ بھی کیا۔ لیکن وہ کسی طرح یقین مان نے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ بعد میں کوئی اس کا اظہار بھی کرتا تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتیں۔ ایک سانس میں سیکڑوں کوسنے دے ڈالتیں۔ لہٰذا سب نے اس سلسلے میں بات کرنا ہی ترک کر دیا بلکہ بعض عورتوں نے تو طرح، طرح کے قصے کہانیاں سنا کر ٹھگنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ آئے دن نت نیا قصہ گڑھ کر لاتیں اور سکینہ بیگم سے کچھ نہ کچھ اینٹھ کر لے جاتیں۔

سکینہ بیگم ہر تہوار پر بیٹے کا نیا جوڑا سلواتیں۔ خاندان کی ہر خوبصورت لڑکی کے لئے اپنے بیٹے کا پیغام دیتیں۔ ڈھونڈ، ڈھونڈ کر مشاطائیں بلواتیں۔ انھیں انعام و اکرام دیتیں اور ان کے ذریعہ بہو تلاش کرواتیں۔ کوئی بیٹے کے بارے میں پوچھتا تو مسکرا کر کہتیں۔ "بس آنے ہی والا ہے۔ کل ہی تو ایک شخص ڈیوڑھی پر آیا تھا جس سے اس نے میری خیریت دریافت کی تھی۔" کبھی اس کے خط کا حوالہ دیتیں اور پھر مزے لے لے کر اس کے بارے میں باتیں کرنا شروع کر دیتیں۔ سننے والے ان کی باتیں سن کر دل ہی دل میں افسوس کرتے۔ خبطی اور سنکی کہتے۔ ان کی دیوانگی دیکھ کر کف افسوس ملتے۔

وہ ہر روز بیٹے کی آمد کا انتظار کرتیں۔ ہر شام نہایت اہتمام سے اس کے لئے کھچڑی پکواتیں، رات گئے تک منتظر رہتیں۔ صبح ہوتی تو کھچڑی باسی ہو جاتی۔ محلے کے کسی محتاج اور مسکین کا اس سے پیٹ بھر جاتا۔ کئی سال سے یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ جب سے عبداللہ ایک ٹانگ سے معذور ہوا تھا، باسی کھچڑی سے اسے بھی حصہ مل جاتا۔ سویرے سویرے اس کی بیوی اٹھ کر سکینہ بیگم کے دروازے پر جاتی اور جب واپس گھر آتی تو میاں بیوی کے لئے ایک وقت کے کھانے کا بندوبست ہو جاتا۔

☆

عبداللہ کے شب و روز اسی طرح نیم فاقہ کشی اور تنگ دستی میں کٹ رہے تھے۔ اتفاق سے اس کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ طبیعت ایسی بگڑی کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ عبداللہ کو کئی روز فاقہ کرنا پڑا۔ آخر جب پیٹ کی آگ بجھانے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ایک روز اس نے اپنی بے ساکھی سنبھالی

اور اس کے سہارے چلتا ہوا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ سر شام ہی محلے میں سناٹا پڑ گیا تھا۔ گلی کوچے ویران ہو گئے تھے۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ عبداللہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قبرستان سے ملحق تنگ و تاریک گلی میں داخل ہوا۔ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ دھندلی دھندلی روشنی میں اسے کسی آدمی کا سایہ نظر آیا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ عبداللہ جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ جب وہ قریب آیا تو عبداللہ نے جھجکتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے سامنے کر دیا۔ راہگیر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ عبداللہ کا چہرہ اندھیرے میں اس قدر ڈراؤنا لگا کہ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ پھر وہ پڑا بھی زمین پر گر گیا جو اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔

عبداللہ خود بھی گھبرا گیا۔ چند لمحے حیران و پریشان کھڑا رہا۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو اس نے فرش پر پڑے ہوئے پڑے کو دیکھا۔ جھک کر اسے اٹھایا۔ کھول کر نظر ڈالی۔ گرم گرم امرتیاں تھیں۔ عبداللہ کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ گھبراہٹ ہوا ہو گئی۔ فوراً گھر پہنچا۔ میاں بیوی نے مزا لے لے کر امرتیاں کھائیں اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

دوسرے روز عبداللہ رات کو پھر اسی گلی میں پہنچا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ سردی اور بڑھ گئی تھی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ وہ دیر تک گلی میں قبرستان کے احاطے کی دیوار سے لگا کھڑا رہا لیکن کوئی بھولے سے بھی ادھر نہ آیا۔ سردی سے عبداللہ کا جسم کپکپا رہا تھا۔ آخر جب وہ مایوس ہو کر لوٹ رہا تھا تو اچانک ایک مونگ پھلی بیچنے والا گلی میں داخل ہوا۔ عبداللہ پلٹا اور اس کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر اس نے ہاتھ پھیلانے کے بجائے ناک میں منمنا کر کہا۔

"ذراں بانت سن ناں بھائی!"

عبداللہ کا ہیبت ناک چہرہ، بھوت پریتوں کا سا لہجہ اور سنسان رات، مونگ پھلی والے پر کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ لمحہ بھر تک آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے چیخنے کی بے سود کوشش کرتا رہا، پھر لڑکھڑایا اور گر کر بے ہوش ہو گیا۔ اس کا خوانچہ بھی گر گیا۔ عبداللہ نے فرش پر بے سدھ پڑے ہوئے پھیری والے کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ جلدی جلدی اپنی چادر کے پلو میں

سیر، سوا سیر مونگ پھلیاں باندھیں اور بیساکھی کے سہارے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

ان دو واقعات سے محلے بھر میں سنسنی پھیل گئی۔ گھر گھر چرچا ہونے لگا کہ کرنل کا بھوت آج کل راہگیروں کو بہت پریشان کر رہا ہے۔ رات کو گلی کوچوں میں منڈلاتا رہتا ہے۔ ڈراتا ہے، دھمکاتا ہے۔ جتنے منہ تھے، اتنی باتیں۔ قبرستان کے آس پاس رہنے والوں پر تو اور بھی زیادہ دہشت طاری تھی۔ وہ سر شام ہی دروازے بند کر کے گھروں میں بیٹھ جاتے۔ عبداللہ نے خوف اور دہشت کی اس فضا سے اور بھی فائدہ اٹھایا۔

رات گئے جب راستے سنسان ہو جاتے اور ہر طرف ہو کا عالم ہوتا تو عبداللہ اپنی میلی کچیلی چادر اوڑھتا۔ خاموشی سے باہر نکلتا۔ قبرستان سے ملحق گلی میں داخل ہوتا اور اندھیرے میں دبک کر کھڑا ہو جاتا۔ ادھر کوئی بھولا بھٹکا راہگیر گلی میں داخل ہوا اور عبداللہ چوکس ہو کر اس کی گھات میں فوراً لگ گیا۔ قریب آتے ہی وہ بڑی خوف ناک آواز میں منمنا کر صدا بلند کرتا "مکھن ٹوش!" راہگیر اس کی آواز سنتے ہی دہشت زدہ ہو جاتا۔ عبداللہ نے اب باقاعدہ کرنل کے بھوت کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ اس کا یہ حربہ کارگر بھی ثابت ہوا۔ پہلے وہ صرف کھانے پینے کی اشیا پر اکتفا کر لیا کرتا تھا پھر ایسا ہوا کہ اگر کوئی خوف سے بے ہوش ہو جاتا تو وہ اس کی جیبیں ٹٹولتا۔ جامہ تلاشی لیتا اور جو کچھ اس کے پاس ہوتا اپنے قبضے میں کر لیتا۔

محلے میں کرنل کے بھوت کا چرچا روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگوں میں سخت خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ دوسری طرف عبداللہ اپنے کام میں اتنا مشاق اور اتنا نڈر ہو گیا تھا کہ اکثر اندھیرے سے نکل کر جھپٹتا اور اپنے شکار کو دبوچ لیتا۔ کسی کو "مکھن ٹوش" کی خوف ناک صدا سے اور کسی کو صرف لرزہ خیز قہقہہ لگا کر بدحواس کر دیتا۔ کسی کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی، کسی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ کبھی چہرہ کھلا ہوتا کبھی چادر سے چھپا ہوتا۔ جیسا موقع ہوتا اسی مناسبت سے اپنا حربہ استعمال کرتا۔

آخر ایک ایسا وقت آیا کہ راہ گیروں اور پھیری والوں نے رات کو قبرستان والی گلی سے گزرنا ہی چھوڑ دیا۔ کوئی بھولے سے بھی اس میں داخل نہ ہوتا۔ لیکن عبداللہ پر کوئی اثر نہ پڑا۔ وہ اس قدر دیدہ دلیر ہو گیا تھا کہ اندھیری اور سنسان راتوں میں گلی سے نکل کر باہر چلا جاتا اور راہگیروں کو ڈرا دھمکا کر جو کچھ ملتا، ہتھیا لیتا۔ گھر واپس جا کر بیوی کے سامنے اسے ڈال دیتا اور مسکرا کر کہتا: "آج

صرف اتنا ہی فرق ہوا: پہلے وہ پوچھ گچھ کرتی تھی، تشویش کا اظہار کرتی تھی لیکن وہ بھی اب علوی ہو گئی تھی۔ دونوں کی مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔

محلے والے بھی اب اس قدر دہشت زدہ ہو گئے تھے کہ سورج غروب ہوتے ہی کوچہ و بازار کی رونق اجڑ جاتی۔ ہر طرف ویرانی برسنے لگتی۔ سناٹا شدید ہو جاتا اور اس ہولناک سناٹے میں عبداللہ اطمینان سے کسی گلی کے نکڑ پر اندھیرے میں دبکا ہوا کھڑا ہوتا۔ اس کا چہرہ اب اور بھی ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے ٹپکتی ہوئی دہشت اور بڑھ گئی تھی اور اس کی آواز میں دم توڑتے ہوئے انسان کا سا کرب پیدا ہو گیا تھا۔ وہ دن بھر اپنی کوٹھری میں پڑا سوتا رہتا۔ پھر رات گزرتے ہی چادر اٹھاتا اور جسم کے گرد لپیٹ کر بیساکھی کے سہارے باہر چلا جاتا اور ویران گلیوں میں اپنے شکار کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔

✡

جاڑوں کا چل چلاؤ تھا اور گرمی کی آمد، آمد تھی۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ عبداللہ کو کئی روز تک کوئی شکار نہ ملا۔ اس کی بیوی نے سکینہ بیگم کے گھر ایک مدت سے آمدورفت بند کر دی تھی۔ دونوں بالکل قلاش تھے، لہٰذا مسلسل کئی وقت کے فاقے کرنا پڑے۔

بیوی گھر میں اکیلی تھی۔ رات گہری ہو چکی تھی، مگر بھوک کے مارے اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس رات، عبداللہ جلد ہی گھر سے باہر چلا گیا تھا اور بے چینی کے عالم میں اندھیری گلیوں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی لیکن عبداللہ کو کوئی بھی بھولا بھٹکا راہگیر نہ ملا۔ گلی کوچے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔

عبداللہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ رات کی وہ گھڑی قریب آتی جا رہی تھی جب صرف گشت کرنے والے کانسٹیبلوں کے بھاری بھاری بوٹوں کی آہٹ سنائی پڑتی جن کی نظروں سے بچنے کے لئے اُسے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عام طور پر آدھی رات سے پہلے ہی واپس گھر پہنچ جاتا تھا۔ مگر آج رات وہ خالی ہاتھ واپس جانا نہ چاہتا تھا۔

آخر جب کوئی شکار ہاتھ نہ آیا تو اس نے ایک نیا حربہ آزمانا چاہا۔ کسی راہگیر کی گھات میں [illegible] کھڑے ہونے کے بجائے وہ کسی مکان کو تاڑتا۔ قریب جاتا۔ دروازے سے کان لگا کر

اندر کی سن گن لیتا۔ وہ کئی مکانوں کے دروازوں پر پہنچا۔ سن گن لینے کی بھی کوشش کی، لیکن ہمت نہ ہوئی۔ پھر ایک مکان کو اس نے تاکا۔ دروازے پر پہنچ کر آہستہ سے دستک دی۔ لیکن اس وقت وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس نے رک رک کر کئی بار دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد اندر سے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔

"کون ہے ؟"

"دروازہ کھولو" عبداللہ نے آہستہ سے کہا۔

قدموں کی آہٹ ابھری اور دروازہ کھول کر کسی نے منہ باہر نکالا۔ پوچھا: "کون ہے؟ سامنے آؤ۔"

عبداللہ اندھیرے سے نکل کر ایک دم سامنے آ گیا۔ اس نے خوفناک لہجے میں منمنا کر صدا بلند کی: "مکھن ٹوش۔"

اس شخص کی سٹی گم ہو گئی۔ گلا پھاڑ کر چیخا: "باپ رے باپ۔"

عبداللہ نے اس دفعہ اور بھی ڈراؤنی آواز میں کہا: "مکھان ٹوش۔"

وہ شخص بدحواس ہو کر چلانے لگا: "بھوت، بھوت۔"

سابقہ تجربے کے پیش نظر عبداللہ کو اب وہاں سے کھسک جانا چاہیئے تھا۔ مگر وہ ڈھیٹ بنا دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ اس نے سوچا کہ اب تو یہ خوف زدہ ہو ہی چکا ہے، ایک وار اور کروں گا تو بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔ اس نے انتہائی خوفناک لہجے میں صدا بلند کی۔

"ماکھان ٹوش۔"

اس بار اس شخص پر یہ ردعمل ہوا کہ وہ اور بھی زیادہ دہشت زدہ ہو کر چیخنے چلانے لگا۔ یہ بیٹھک کا دروازہ تھا جس میں کچھ اور لوگ بھی سو رہے تھے۔ وہ بھی بیدار ہو گئے۔ ذرا دیر تو وہ سہمے ہوئے دم بخود پڑے رہے۔ پھر سب بدحواس ہو کر چیخنے لگے۔

"بھوت، بھوت!!"

اتنی بہت سی آوازوں کا شور سن کر عبداللہ بھی گھبرا گیا۔ وہ اپنی بیساکھی سنبھال کر مڑا۔ آگے بڑھا اور کسی نہ کسی طرح قبرستان کے ساتھ والی تنگ و تاریک گلی میں داخل ہو گیا۔ اب پاس

پڑوس کے مکانوں کے رہنے والے بھی بیدار ہو گئے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے، جو ہمت کرکے گھروں سے نکل، نکل کر باہر آنے لگے۔ وہ اونچی اونچی آوازوں میں بول رہے تھے۔ عبداللہ نے محسوس کیا کہ گلی کے دونوں سروں پر ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔ گلی سے باہر نکلنے کی گنجائش نہ تھی۔ ادھر اُدھر جانے کے بجائے وہ اندھیرے میں ایک دیوار کے ساتھ دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

ناگاہ گلی کے پختہ فرش پر قدموں کی آہٹ ابھری اور کوئی تیزی سے آکر عبداللہ سے ٹکرایا۔ لڑکھڑایا، مگر گرا نہیں۔ "وہ بھوت، بھوت" کہتا ہوا سرپٹ بھاگا۔ پھر تو ہر طرف سے ملی جلی آوازیں ابھرنے لگیں۔

عبداللہ سوچ ہی رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ اسی اثنا میں ایک پتھر اس کے داہنے کندھے پر آکر زور سے لگا۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ پتھروں کی بارش شروع ہو گئی۔ ہر طرف سے پتھر آ، آ کر گلی میں گرنے لگے۔ ساتھ ہی ملی جلی آوازیں بھی اُبھرتی رہیں۔

"گلی میں بھوت ہے۔"

"وہ دیکھو، کچھ نظر تو آرہا ہے۔"

"ہاں، ہاں دیوار کے ساتھ کوئی اندھیرے میں کھڑا ہے۔"

اچانک غلغلہ بلند ہوا "بھوت، بھوت" اور پتھروں کی بارش تیز ہو گئی۔ پتھر آ، آ کر عبداللہ کے جسم سے ٹکرا رہے تھے اور ایک پتھر تو اس زور سے ماتھے پر لگا کہ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت ایک اور پتھر اس کی کن پٹی پر لگا۔ عبداللہ نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔

قریب ہی ایک گہری، بدرو تھی۔ عبداللہ نے سوچا کہ کسی طرح اگر بدرو میں داخل ہو جائے تو سنگ باری سے بچ جائے گا۔ اس نے ہمت سے کام لیا اور دھیرے دھیرے بدرو کی جانب کھسکنے لگا۔ مگر وہ بدرو کے قریب پہنچا بھی نہ تھا کہ ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر آکر لگا۔ عبداللہ جہاں تھا، وہیں رہ گیا۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔

"ہائے مرا۔"

عبداللہ پتھروں کی لگاتار چوٹوں سے بلبلا کر کئی بار چیخا، کئی بار اس نے التجا کی۔ گڑگڑایا بھی، دہائی

بھی دی مگر دوسری طرف اس قدر شور تھا کہ کوئی اس کی آواز نہ سن سکا۔ کسی کے کانوں تک اس کی فریاد نہ پہنچی۔ پتھروں کی بارش مسلسل ہوتی رہی۔ لوگ گلا پھاڑ، پھاڑ کر چیختے رہے۔ وہ اس وقت گلی کے بھوت کو سنگسار کرنے پر تلے ہوئے تھے وہ پاگلوں کی طرح چلّا رہے تھے اور گلی میں بے تحاشہ پتھر برسا رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کا شور بڑا خوف ناک معلوم ہو رہا تھا۔

دوسرے روز محلّے والوں نے دیکھا۔ گلی کے بیچوں بیچ ایک بے حد غلیظ آدمی منہ اوندھائے پڑا تھا۔ اس کے چاروں طرف پتھر ہی پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے کالے کلوٹے جسم کے ہر حصے پر گاڑھا، گاڑھا خون بہہ کر جم گیا تھا۔ اس کا خوفناک چہرہ بدرو کے اندر تھا اور کیچڑ میں لت پت تھا۔ یہ عبداللہ تھا جو رات ہی مر گیا تھا۔

راتوں کا شہر

دونوں

کاٹھیاواڑی دلال بہت دیر سے کاٹن کی سٹے بازی کے بارے میں باتیں بات کر رہے تھے۔ پھر نہ جانے ان کو کیا سوجھی کہ اچانک میونسپل کارپوریشن کا ذکر لے بیٹھے اور آخر میں محکمہ موسمیات کو گالیاں دیتے ہوئے اُٹھ کر چل دیے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کی سانس لی اور خالی بنچ پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

یہ نومبر کی ایک سنسان رات تھی، شبنم سے بھیگی ہوئی ہوا میں خنکی تھی اور فضا میں ہلکا ہلکا غبار رچا ہوا تھا۔ سڑکوں پر گاڑیوں کا شور مدھم پڑ گیا تھا اور راہ گیر بھی اکا دکا نظر آتے تھے۔ اس مختصر سے ٹریفک آئیلینڈ پر کہیں کہیں لوگ سکڑے سکڑائے پڑے تھے۔ سیمنٹ کی بنی ہوئی بنچوں پر، ٹھنڈے فرش پر، درختوں کے نیچے، ہر جگہ انسانی جسم لاشوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔

میں بنچ پر لیٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسی اثنا میں ایک شخص نہ جانے کہاں سے آ گیا۔ اس نے بڑی بدتمیزی سے میری ٹانگیں ایک طرف ہٹائیں اور بنچ پر جم کر بیٹھ گیا۔ مجھے اس کی حرکت پر سخت غصہ آیا۔ غصے کی بات ہی تھی۔ اس روز بھی حسبِ معمول کہیں رات بسر کرنے کا بندوبست نہ تھا۔ لہٰذا بازار میں سناٹا ہوتے ہی میں نے یہاں کا چکر کاٹنا شروع کر دیا تھا۔ بڑی دیر کے بعد ایک خالی بنچ ملی، تو یہ شخص موت کے فرشتے کی طرح آ دھمکا۔ میں نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وضع قطع سے وہ خطرناک غنڈہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اسی میں اپنی خیریت سمجھی کہ گھٹنوں میں سر دبا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات کا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔ نم آلود ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ کبھی کبھی سنسان سڑک پر کوئی کار

تیزی سے سنسناتی ہوئی گزر جاتی۔ رکشا اسٹینڈ پر بلی جلی آوازوں کا شور اُبھرتا اور ڈوب جاتا۔ ٹریفک آئیلینڈ کے پاس پہنچ کر کوئی چمپی والا زور سے پی پی کی آواز لگاتا اور کسی چالو فلم کا گیت گنگناتا ہوا گزر جاتا۔ میں آنکھیں بند کیے ہر آہٹ کو، ہر آواز کو خاموشی سے سنتا رہا۔ میرے برابر بیٹھا ہوا خطرناک غنڈہ ابھی تک بالکل چپ تھا۔ شاید وہ اونگھ رہا تھا یا سو گیا تھا یا اُسے بھی میری طرح بنچ کے خالی ہو جانے کا انتظار تھا۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد میں نے سُنا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا "کیوں جی کیا بجا ہو گا؟" معلوم نہیں اُسے یہ کیسے پتہ چل گیا کہ میں ابھی تک جاگ رہا ہوں۔

میں نے گھٹنوں پر سے سر اُٹھا کر بے رُخی سے جواب دیا "میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔"

"کوئی ڈیڑھ بج گیا ہو گا" یہ بات اس نے اس طرح کہی جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔ پھر اس نے کان میں لگے ہوئے آدھ جلے سگریٹ کا ٹوٹا نکالا اور اُسے سلگا کر کش لگانے لگا۔ لیکن وہ زیادہ دیر خاموش نہ رہا کہنے لگا "یار آج سردی کچھ زیادہ ہے۔ جاڑا اب آ ہی گیا۔"

"ہاں" میں نے بڑا مختصر سا جواب دیا۔

وہ بولا "تو اب تم سو کیوں نہیں جاتے؟"

میں نے جل کر کہا "مجھے اکڑوں بیٹھ کر نیند نہیں آتی۔"

آدمی حساس تھا، میری بات کا مطلب فوراً بھانپ گیا۔ ہنس کر کہنے لگا "اماں تو یوں کہو۔ تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ کہی۔ لے بھائی میں تو چلا تو ناراض نہ ہو" اتنا کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

اس کے وہاں سے کھسکتے ہی میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جھٹ سے پوری بنچ پر ٹانگیں پھیلا دیں اور بازو پر سر رکھ کر آنکھیں میچ لیں۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد وہ پھر نازل ہوا اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔

"اماں کیا سو گئے؟"

میں ہٹ مارے خاموش پڑا رہا۔

"استاد کیوں لکڑ کا ٹھ بنے ہو ذرا ٹانگیں تو سرکاؤ" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

مجھے اس کے اس انداز پر ہنسی آ گئی۔ مجبوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "لو بھئی اطمینان سے بیٹھو" اس کے سوا

اور کہتا بھی کیا۔ پڑا رہتا تو وہ پھر ٹانگیں پکڑ کر ایک طرف کر دیتا۔ میں اس کا کیا بگاڑ لیتا۔

اب وہ خواہ مخواہ مجھ سے مانوس ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہنس کر بولا: "یار خفا کیوں ہوتے ہو۔ ابھی تو بہت رات پڑی ہے سو لینا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن وہ خود ہی چھیڑ کر بولا: "چائے پیو گے؟"

میں نے انکار کر دیا۔

"نہیں جی، یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ چائے پینے کا مزہ تو اسی وقت ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے بھڑ سے گالی دی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اپنی شلوار کا نیفا ٹٹول رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے لوہے کی ایک خم دار سلاخ نکال کر سامنے ڈال دی اور کمر سہلاتے ہوئے بولا: "سالی نے گھاؤ ڈال دیا۔"

میں نے حیرت زدہ ہو کر ہاتھ بھر کے اس لوہے کے ٹکڑے کو دیکھا اور اس سے پوچھنے لگا: "یہ کیا ہے؟"

کہنے لگا: "کمائی کا ٹھیکرا" اور اسی طرح اطمینان سے بیٹھا کمر سہلاتا رہا۔

میں اور بھی حیرت زدہ ہو کر بولا۔ "یار ٹھیک سے بتاؤ یہ کیا جادو منتر ہے۔"

میری بات پر اُسے ہنسی آ گئی۔ بڑی بے تکلفی سے بولا: "پیارے دل خوش کر دیا۔ آدمی تم بھی کینڈے کے لگتے ہو۔" لمحے بھر توقف کے بعد کہنے لگا: "تو پھر ہو جائے کچھ چائے پانی۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کوئی سانولے خاں ملا تھا۔"

مگر اس کے ساتھ جانے کو جی نہ چاہا۔ "نہیں بھئی مجھے تو اب تم سو ہی جانے دو۔"

وہ باز نہ آیا۔ میرا بازو پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے بولا: "یار ان باتوں میں کیا دھرا ہے، آؤ میرے ساتھ۔"

بادلِ نخواستہ مجھے اس کے ہمراہ چلنا پڑا۔ کچھ دُور تک ہم دونوں سنسان سڑک پر چلتے رہے، پھر ایک گلی کے نکڑ پر وہ ٹھٹکا۔ اس نے چاروں طرف ایک چوکنا نظر ڈالی۔ آگے بڑھا اور لپک کر ایک دُکان کے دروازے پر پہنچ گیا اور لوہے کی خمیدہ سلاخ تالے میں ڈال کر آہستہ سے بولا۔ "کھل جا میری جان سُم سُم" اور تالا جھٹ سے کھل گیا۔ اسی وقت گلی کے دوسرے سرے پر

قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور مُنہ قریب لا کر سرگوشی کی۔

"یار! چوکیدار آ رہا ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں تم ایسا کرو۔ لپک کر اس کے پاس پہنچ جاؤ اور اس کو باتوں میں لگا لو۔ بس یوں ہی کچھ پوچھنا شروع کر دو۔ میں تم کو نالے کی پُلیا پر ملوں گا اور ہاں ——؟"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور دکان کا ایک پٹ کھول کر اندر چلا گیا۔ خوف کے مارے میری حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ یا اللہ یہ آج کس مصیبت میں پھنسا۔ ایکا ایکی بجلی کے کھمبے کے پاس روشنی میں ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ سوچنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں اسی طرف چل دیا۔

چوکیدار نے مجھے دیکھ کر دور ہی سے آواز لگائی: "کون ہے؟"

گھبراہٹ کے باعث حلق سے میری آواز نہ نکل سکی۔ مگر وہ میرے قریب نہ آیا۔ شاید وہ بھی خوف زدہ تھا۔ اس نے زمین پر زور، زور سے لاٹھی بجا کر اس دفعہ کسی قدر اونچی آواز میں پوچھا۔

"کون ہے گلی میں؟"

میں اب اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو۔"

وہ سینہ تان کر بولا: "پر تم بولتا کیوں نئیں، وہاں اندھیرے میں کیا کرتا تھا۔ تمارا ادھر کیا کام؟"

سرحد کا وہ چوڑا چکلا پٹھان میرے سر ہو گیا۔ میں نے اسے مطمئن کرنے کی غرض سے نرم لہجے میں کہا: "لالہ! بات یہ ہے کہ مجھ کو ایک شخص کا پتہ معلوم کرنا تھا۔"

وہ اور بھی بھڑک اُٹھا: "رات کا دو بجے پتہ معلوم کرتا ہے۔ خو چہ تم کیسا بات کرتا ہے؟"

میں نے دل میں سوچا کہ اس سالے اُٹھائی گیرے نے تو آج پھنسوا ہی دیا۔ یہ اکھڑ پٹھان کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ لیکن خیریت یہ ہوئی کہ آس پاس کوئی اور چوکیدار نہ تھا۔ ورنہ دھر لیے جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔ آخر میں نے اُسے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

"لالہ، تم ان کو ضرور جانتے ہو گے، ان کا نام عظیم اللہ ہے۔ وہ سرکاری دفتر میں افسر ہیں۔"

میں نے خواہ مخواہ اس موقع پر دو چار انگریزی کے الفاظ بھی بولے۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ چوکیدار ذرا نرم پڑ گیا۔ آہستہ آہستہ گردن ہلا کر بولا: "عظیم اللہ! ہاں ہم اس کو جانتا ہے، ایک دم لمبا ہے۔ خوب شراب میں ڈاؤن رہتا ہے۔ روز گھر میں جھگڑتا ہے، بُوت بوم مارتا ہے۔"

میں نے فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی: "بالکل ٹھیک۔ لالہ! وہی عظیم اللہ۔ تم یہ بتا دو کہ اس کا فلیٹ کون سا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔" کہنے کو تو میں نے یہ بات کہہ دی، پھر خود ہی گھبرا بھی گیا۔ لیکن جب اس نے بتایا کہ "پر وہ تو اب یہاں سے چلا گیا۔ اس کا تھور بدلی ہو گیا" تو میری جان میں جان آئی۔

میں نے خواہ مخواہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "یہ نہیں خان وہ تو یہیں ہو گا۔"

وہ ذرا دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا "ہم کو ٹھیک سے نئیں ملوم۔ یہ فلیٹ میں رہنے والا سا ب لوگ روز بگڑی پر فلیٹ چلاتا ہے، پتہ نئیں تم کس کو پوچھتا ہے۔"

میں نے اصرار کیا "لالہ! بہت ضروری کام ہے۔ تمھاری بڑی مہربانی ہو گی۔"

مگر اب وہ اُکتا چکا تھا مڑتے ہوئے بولا "یا یا ہم کو کچھ پتہ نئیں، جاؤ آگے پوچھو۔" میں نے سوچا کہ اب تک تو سانولے خاں اپنا کام کر چکا ہو گا۔ لہٰذا میں نے اس جوڑے چکلے پٹھان سے مزید اُلجھنا مناسب نہیں سمجھا اور چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

کئی گلیوں کا چکر کاٹ کر جب میں نالے کی پُلیا پر پہنچا تو سانولے خاں وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ہولے سے سیٹی بجا کر سگنل دیا۔ وہ اندھیرے میں ایک دیوار کے پاس کھڑا تھا: "یار تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟" اس نے دریافت کیا۔

میں اسے اپنی کارگزاری سنانے لگا مگر اس نے پوری تفصیل نہیں سُنی۔ بڑے پیار سے میرے شانے تھپ تھپا کر بولا "یار! میں نے تو تیری ایک ہی بات سے تاڑ لیا تھا کہ یہ اپنے کینڈے کا آدمی ہے۔"

"اچھا اب مجھے چلنے دو، ورنہ بیچ پر کوئی اور آ دھمکے گا۔"

وہ ہنس کر بولا "چھوڑ یار، سالی بیچ کو۔ کس چکر میں پڑ گیا اب ذرا یار لوگوں کے عیش ہوں گے۔ کام پورا چوکس ہوا ہے۔"

میں نے ایک بار پھر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی: "نہیں بھئی سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔" مگر وہ کہاں باز آنے والا آسامی تھا۔ کہنے لگا "اُستاد! دل نہ توڑو۔ اس کام میں دونوں ہی کا ساجھا ہے۔ میں کبھی چھوٹا پن نہیں کرتا۔ ہمیشہ مل بانٹ کر کھاتا ہوں" اس نے بے تکلفی سے میری پیٹھ تھپ تھپائی: "یار! زیادہ نخرے نہ دکھا۔ آ میرے ساتھ۔" اس نے ایک موٹی سی گالی دی۔

وہ آگے بڑھا۔ میں چپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہم دونوں اب کشادہ سڑکوں کے

بجائے تنگ و تاریک گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ اندھیرے کے باعث میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ البتہ اتنا اندازہ ضرور تھا کہ سانولے خاں کی بغل میں ایک ڈبا دبا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اور بھی بدحواس ہو رہا تھا کہ کہیں راستے میں گشت کرنے والے کانسٹیبل مل گئے تو دونوں مع مال مسروقہ پکڑے جائیں گے۔ کچھ یہی سوچ کر میں نے اس سے کہا۔

"بھئی مجھے تو اب تم جانے ہی دو۔"

میری آواز خوف سے کانپ رہی تھی۔ میری گھبراہٹ اور سراسیمگی دیکھ کر وہ ٹھٹھول پن پر اتر آیا۔ ہنس کر کہنے لگا "یار تو اتنا ڈر کیوں رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو گا کہ رات حوالات میں کاٹنا پڑے گی۔ دونوں مزے سے ٹانگیں پھیلا کر صبح تک سوئیں گے۔" وہ آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

میں نے چپ رہنے ہی میں مصلحت سمجھی۔ خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس نے گنگناتے گنگناتے آواز ذرا اونچی ہی کی تھی کہ دفعتہً ایک شخص جھپاک سے نکلا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ سانولے خاں فوراً خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں ٹھٹک کر رہ گئے۔ جب وہ دور چلا گیا تو سانولے خاں سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا۔

"سالے نے خواہ مخواہ ڈرا دیا۔ اپنا ہی کوئی بھائی بند معلوم ہوتا ہے۔"

اس دفعہ بھی میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

کچھ دور تک ہم خاموش چلتے رہے۔ آخر ایک ایسی جگہ پہنچ کر ہم دونوں رُک گئے جہاں بیشتر بوسیدہ اور نیم پختہ مکانات تھے۔ ہر طرف گمراسناٹا تھا۔ بستی اندھیرے میں قبرستان کی طرح اجاڑ معلوم ہو رہی تھی۔ سانولے خاں ایک تنگ گلی میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے میں بھی آگے بڑھنے لگا۔ اندھیرا اس قدر زیادہ تھا کہ سانولے خاں مجھے دھندلی پرچھائیں کی طرح لگ رہا تھا۔

ہم دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ گلی کے اندر چل رہے تھے۔ کوئی سو قدم ہم اسی طرح چلتے رہے۔ پھر ایک مکان کی دیوار کے قریب سانولے خاں رک گیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولا "آگے جانے کی ضرورت نہیں۔" وہ چند لمحے خاموش کھڑا سُن گُن لیتا رہا۔ جب کوئی آہٹ سنائی نہیں دی

تو وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ذرا دیر بعد آہستہ آہستہ دروازہ کھٹ کھٹانے کی آواز ابھرنے لگی۔ اسی وقت کسی کی کھنکار بھی سنائی دی پھر آہستہ سے دروازہ کھلا اور دبی دبی سرگوشیاں ہونے لگیں۔

سانولے خاں میرے پاس آیا اور آہستہ سے بولا "میرے ساتھ چلو" میں اس کے ہمراہ چلتا ہوا ایک مکان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ میں بھی اندر چلا گیا۔ فوراً ہی کسی نے جھٹ سے دروازہ کا بولٹ چڑھا دیا۔ وہاں بالکل اندھیرا تھا۔

ہم دونوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچے یہاں ایک موم بتی جل رہی تھی۔ میں نے دیکھا ہم دونوں کے علاوہ کمرے میں ایک شخص اور بھی موجود تھا۔ وہ ادھیڑ عمر تھا اور پستہ قد کا کچھ گول مٹول سا تھا۔ اس کی توند خوب آگے لٹکی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کچھ بھونچکا سا ہو گیا۔ سانولے نے مسکرا کر فوراً اُسے اطمینان دلایا۔

"سیٹھ! یہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

وہ اپنے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا "اچھا اچھا بیٹھو۔ پر بڑی ہسیاری کی جرورت ہے۔ سالا لوگ کتے کی طرح سونگتا پھرتا ہے"، وہ اپنے مخصوص کاروباری لہجے میں بات کر رہا تھا۔ سانولے خاں جو ہمیشہ پریشانی کے موقع پر مسخرہ پن کرنے لگتا تھا، اسے چھیڑنے لگا۔

"سیٹھ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم پکڑے جائیں گے تو تم کو بھی ہمارے ساتھ جیل کاٹنا پڑے گی۔ مزے کی گزرے گی، یہ تمہاری ساری توند وند ایک دم پچک کر رہ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا!"

وہ بگڑ کر بولا "تم سالا برد بر بدماسی کی بات کرتا ہے۔ اپن کو تمہاری یہ مسکری بازی بالکل پسند نہیں"۔ وہ دیر تک بڑبڑاتا رہا۔

سانولے اس کو منانے لگا "یار سیٹھ، تُو تو مذاق ہی مذاق میں بگڑ جاتا ہے۔ اچھا اب کام کی بات کرو" سیٹھ کو شاید اسی بات کا انتظار تھا۔ فوراً راضی ہو گیا، اس نے سامنے رکھے ہوئے۔ ٹرانزسٹر ریڈیو پر ہاتھ پھرا کر چاروں طرف سے دیکھا اور سوکھا سا منہ بنا کر بولا۔

"سانولے، یہ تم آج کیا کنڈم مال اٹھا لایا، یہ تو ایک دم گڑ بڑ گھٹالا ہے۔"

سانولے گردن ہلا کر بولا "واہ استاد یہ ایک ہی کہی سیدھی سیدھی معاملہ کی بات کرو۔ سیٹھ

اپنے سے یہ ڈرکیں نہیں چلیں گی۔"

وہ کہنے لگا "دیکھو بابا۔ یہ مشینری کا کام بڑا کھترناک ہے۔ کسٹمر لوگ اسے کھریدتے ہوئے ڈرتا ہے۔"

سانولے خاں کے لیے یہ پہلا موقع نہیں تھا۔ وہ ان کاروباری ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتا تھا۔ کہنے لگا "سیٹھ بات ٹھیک ٹھیک کرو، موسیٰ بھائی ابراہیم جی کا گھر یہاں سے دور نہیں۔ وہ خوشی خوشی سودا کرے گا۔ ایک بات بولو۔ خرید وگے کہ نہیں؟" اتنا کہہ کر سانولے ٹرانزسٹر اٹھانے لگا۔ وہ جھٹ سے بولا۔

"تم اپن سے کس مافک بات کرتا ہے سانولے خاں۔ تمہارا ہمارا لین دین ہے تو اسے کھریدینگا اور جو مال لائینگا وہ بھی کھریدینگا۔"

"تو پھر بولی کیا دیتے ہو؟ ایک دم فسٹ کلاس چیز ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چُپ چاپ گھر کے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد نکلا تو اس کے ہاتھ میں سو روپے کا نوٹ تھا۔ سانولے اتنی قیمت پر ٹرانزسٹر بیچنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ بڑی دیر تک حجّت ہوتی رہی۔ آخر سوا سو روپے پر سودا ہوا۔ اس میں سے بھی اُس بوڑھے گھاگ نے ایک روپیہ سانولے کی خوشامد کر کے توڑ ہی لیا۔

وہاں سے نکل کر ہم دونوں سیدھے ایک ایرانی ہوٹل میں پہنچے۔ سانولے اس وقت بادشاہ بنا ہوا تھا۔ آرڈر پہ آرڈر دے رہا تھا۔ دونوں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ کئی بار چائے بھی پی۔ بینڈ نے پھر مجھے پریشان کرنا شروع کر دیا لہٰذا میں نے اس سے کہا "بھئی اب لیٹنے کا کچھ بندوبست ہونا چاہیئے۔"

وہ جھوم کر بولا "ہاں جی لیٹنے کا بندوبست بھی ہوگا اور ایسا ٹھاٹ وار کہ تمہاری طبیعت پھڑک اُٹھے گی۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے سوچا، اس سے اچھا اور کیا پروگرام ہوگا۔ جھٹ آمادہ ہو گیا۔ سانولے نے کاؤنٹر پر جا کر بل ادا کیا اور ہم دونوں باہر آ گئے۔ ایرانی ہوٹل سے ذرا فاصلے پر پان کی دکان تھی اور ابھی تک کھلی تھی۔ سانولے خاں سیدھا وہاں پہنچا۔ لمبی سی ایک ڈکار لے کر اس نے پنواڑی سے

بڑے رُعب کے ساتھ کہا۔

"استاد دو میٹھے پان تو بناؤ۔ ایک میں چھالیا ذرا زیادہ ڈالنا۔"

پنواڑی نے دو پان لگا دیے اور بے تکلفی سے آنکھ مار کر بولا "آج تو بڑے زوروں پر نظر آ رہے ہو۔ رنگ کیا ہے!"

سانولے نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "ابے اپنے اوپر کب رنگ نہیں رہا۔ لا اندر سے دو سگریٹ بھی نکال۔ لگے دم مٹے غم!"

وہ رازدارانہ انداز میں بولا "یار دھیرے بول۔" اس نے چاروں طرف چوکنا نظروں سے دیکھا اور الماری کے پیچھے سے دو سگریٹ نکال کر سانولے کو دیں۔

سانولے نے اس کے قریب منہ لے جا کر سرگوشی کی "سگریٹ تو مل گئیں پر اس وقت کچھ معاملہ بھی گٹھ سکتا ہے۔" اس نے بدمعاشی سے آنکھ دبا کر جیب کھنکھنا دی۔

پنواڑی بولا "وہ تو میں پہلے ہی تاڑ گیا تھا۔ مگر تم نے دیر کر دی۔ معاملہ مشکل ہی سے بنے گا۔"

سانولے نے ڈپٹ کر کہا "اب زیادہ نخرہ نہ کر۔ سالے تم نے پھر یہ دکان اب تک کیوں کھول رکھی ہے؟ پبلک کو گھاس پٹی پڑھاتے ہو" وہ بے حیائی سے ہنسنے لگا۔

"یار سانولے خاں تُو تو سر ہو جاتا ہے۔ بابا ناراض نہ ہو۔ تیرے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

پنواڑی نے گردن باہر نکال کر ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوئے رکشاؤں میں سے ایک کو اشارے سے قریب بُلایا۔ جب وہ آ گیا تو اس نے آہستہ سے کہا "یہ دونوں تمھارے ساتھ جائیں گے۔ کمر دینا کر اپنے ہی آدمی ہیں اور دیکھ بے تکرار مت کرنا جو وے دیں وہی لے لینا۔" جب رکشا والا چلا گیا تو پنواڑی نے سانولے سے کہا "اس کو دو روپے دے دینا۔" سانولے نے جیب سے پانچ کا ایک نوٹ نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ کر بولا۔

"یار میں یہ جھنجٹ نہیں پالتا۔ تو خود اس سے نبٹ لینا۔"

پنواڑی کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں، کہنے لگا "تم فکر نہ کرو۔ جاؤ اب دیر کیوں کر رہے ہو۔"

ہم دونوں رکشے پر جا کر سوار ہو گئے اور رکشا چل دیا۔ سانولے نے جیب سے دو سگریٹیں نکالیں، ایک خود سلگائی اور دوسری میرے منہ میں لگا کر بولا "لمبا کش نہ لگانا۔" میں نے سگریٹ سلگا کر پہلا ہی کش

لیا تھا کہ دم گھٹنے لگا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے عجیب سی بُو آ رہی تھی۔ ایسی بُو جو عام سگریٹوں کی بُو سے تیز بھی تھی اور اس میں کڑواہٹ بھی تھی۔

میں نے دو تین بار کھانس کر جلدی سے پوچھا "اماں یہ کیسی سگریٹ ہے؟"

وہ لاپرواہی سے بولا "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ لمبا کش نہ لگانا۔ ذرا تیز سگریٹ ہے۔"

میں آہستہ آہستہ سگریٹ پیتا رہا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرا سینہ سُلگ رہا ہے، گردن کی رگیں تن رہی ہیں اور آنکھوں کے سامنے کالے کالے پردے لہرا رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر قمیض کے بٹن کھول دیے۔ ہوا لگی تو پردے اور بھی تیزی سے لہرانے لگے۔ ان کے ساتھ ہی میں بھی جھومنے لگا۔ ایک بار جھونک میں آ کر میں سانولے پر آ گیا۔

وہ زور سے قہقہہ لگا کر بولا "بڑے زوروں پر چل رہے ہو یار۔ معلوم ہوتا ہے کہ رنگ چڑھ گیا ہے۔"

میں جھٹ سے سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس سے پوچھنے لگا "بھئی سانولے یہ کس تمباکو کی سگریٹ ہے؟" مجھے اپنی آواز اس طرح معلوم ہوئی جیسے میں کہیں دور سے بول رہا ہوں۔

"میری جان اسے چرس کہتے ہیں، کہو مزہ آ گیا۔"

چرس کا نام سنتے ہی میں ایک دم گھبرا گیا۔ اس وقت رکشا بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ میں نے روشنی میں دیکھا۔ سانولے کی آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ جھوم جھوم کر اپنی بھونڈی آواز میں گا رہا تھا "لگے دم مٹے غم" سانولے خاں اس وقت مجھے بہت خوفناک معلوم ہوا۔ پتہ نہیں وہ اس وقت مجھے کہاں لیے جا رہا تھا۔ پنواڑی سے اس نے اشاروں ہی اشاروں میں جو باتیں کی تھیں، وہ میرے لیے معمہ نہیں تو کم از کم عجیب و غریب ضرور تھیں۔ اسی طرح سوچتے سوچتے یک بارگی میرے جسم کے اندر سے ایک رو نکلی اور اس طرح سر پر پہنچی کہ میں لڑکھڑا کر آگے کو جھک گیا۔ میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اسی وقت میں نے سانولے کی آواز سنی، وہ کہہ رہا تھا۔

"اماں تم تو بالکل مرزا پھویا ہو۔"

میں نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سڑک کے ایک موڑ پر اندھیرے میں رکشا کھڑا تھا۔ سانولے نے مجھے سنبھال کر اُتارا۔ رکشے والا کہہ رہا تھا "میں ابھی آیا۔" اور وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

ہم دونوں سڑک کے کنارے خاموش کھڑے رہے۔ ذرا دیر بعد وہ واپس آیا اور سانولے سے بولا۔

"چلیے جی۔" ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ ایک سہ منزلہ عمارت کے قریب رُک کر اس نے دروازہ آہستہ سے کھولا اور ہم تینوں زینہ طے کرتے ہوئے تیسری منزل کے ایک فلیٹ میں پہنچ گئے۔

سامنے ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں روشنی تھی۔ خاصا سجا سجایا کمرہ تھا۔ دیواروں پر نیم برہنہ لڑکیوں کی بڑی بڑی تصویریں لگی تھیں، جن کی سڈول پنڈلیاں، خاص زاویے سے نظر آ رہی تھیں۔ کمرے میں ایک طرف ایک پرانا صوفہ سیٹ پڑا تھا جس پر بھاری بھر کم جسم کی ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی تھی۔ ہم دونوں کو اس نے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے بولی۔

"اس وقت ہم کسی کو اندر آنے نہیں دیتے۔ بارہ بجے اور پھاٹک بند، زیادہ سے زیادہ ساڑھے بارہ۔ تم سلیمان کے جاننے والے ہو، اس لیے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن آیندہ آنا تو جلدی آنا۔"

اس خرانٹ نائکہ نے اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ سانولے بھی اس وقت چوکڑی بھولا ہوا تھا۔ بالوں کو کریدتے ہوئے آہستہ سے بولا "نہیں بائی جی آیندہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ بات یہ ہوئی۔" مگر اُسے زیادہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ اسی وقت کمرے میں دو لڑکیاں داخل ہوئیں۔ ایک خاصی بھرے بھرے جسم کی تھی، اور دوسری کچھ بیمار نظر آ رہی تھی۔ دونوں شاید ابھی ابھی میک اَپ کرکے آئی تھیں۔ چہرے پر پوڈر کھریا مٹی کی طرح لپا ہوا تھا۔ جلدی میں کاجل پھیل گیا تھا اور لپ اسٹک کے دھبے رخساروں کے نچلے حصے پر صاف نظر آ رہے تھے۔

میں نے نظریں چرا چرا کر دونوں کو دیکھا۔ مجھے وہ بڑی ٹوٹی پھوٹی بھونڈی سی معلوم ہوئیں۔ البتہ سانولے اپنی سُرخ سُرخ آنکھوں سے دونوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا، جیسے "بے دیکھنے کی چیز ہے بار بار دیکھ" والا اشتہار پڑھ رہا ہو۔ لیکن ادھیڑ عمر نائکہ نے دیر تک دیکھنے کا موقع نہیں دیا، پوچھنے لگی۔

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟"

سانولے نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "کہو استاد کیا کہتے ہو؟" مجھے خاموش دیکھ کر وہ بڑی بے حیائی سے بولا "اماں تم تو شرمائے جا رہے ہو۔ تم سے تو یہ عورتیں اچھی ہیں کیسے دیدے نکالے دیکھ رہی ہیں۔ بس تم بھی ایک دم فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔"

میں نے جلدی سے کہا "میں کیوں شرمانے لگا" اور میں نے دونوں لڑکیوں کی جانب نظریں اُٹھا دیں۔ ایک تو خاموش رہی لیکن جس کا جسم ذرا گداز تھا وہ بڑے بھدّے پن سے اٹھلا کر بولی "اے اس طرح دیکھو گے تو

ہم کو نظر لگ جائے گی۔" اور دوسری کی پیٹھ کے پیچھے منہ چھپانے لگی۔ عجیب چھچھورپن کا مظاہرہ تھا مگر سانولے اس ادا پر مرمٹا۔ جھوم کر بولا۔

"بائی جی! اب معاملے کی بات کرو۔"

وہ بولی "چلو پہلے میں تم کو جگہ بھی دکھا دوں اس کے بعد بات ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہم دونوں کو لیے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی۔

سامنے مختصر سی چھت تھی۔ اس کے ایک سرے پر راہداری تھی جس سے گذر کر ہم دونوں ایک سائبان کے قریب پہنچ گئے۔ عورت نے سوئچ دبا کر روشنی کی تو میں نے دیکھا کہ سائبان کے نیچے لکڑی کے تختوں کی دیواریں کھڑی کرکے کئی چھوٹے چھوٹے کیبن بنا دیئے گئے ہیں۔ ہر کیبن میں پلنگ پڑا تھا اور میز کرسی بھی موجود تھی۔ بالکل سستے قسم کے ہوٹلوں کا سا بندوبست تھا۔

عورت کہنے لگی "اس وقت تو یہی ملیں گے۔ سارے کمرے بک ہو چکے ہیں۔ لیکن تم کو یہاں بھی ہر چیز مل جائے گی۔ شراب چاہو گے تو وہ بھی مل جائے گی۔ دیسی شرابوں میں ہمارے پاس ہر قسم کی ہے۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ مگر اس کا بل آرڈر کے ساتھ ادا کرنا پڑے گا۔" اس نے قدرے توقف کیا، پھر مڑ کر سانولے خاں کی طرف غور سے دیکھا "تم اطمینان سے یہاں رات بسر کر سکتے ہو۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم بڑی پابندی سے پولیس کو اس کا بھتّا پہنچا دیتے ہیں۔ ویسے تھانیدار صاحب بھی اکثر اپنے مہمانوں کے ہمراہ دل بہلانے آ جاتے ہیں۔"

اس نے ساری تفصیلات ایک ہی سانس میں بتا دیں۔ بڑی منجھی ہوئی کاروباری عورت تھی۔ وہ ہم دونوں کو پھر اسی کشادہ کمرے میں لے آئی۔ سانولے نے دونوں لڑکیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے گھور کر دیکھا اور پوچھنے لگا۔

"اب جو کچھ اور بات رہ گئی ہے وہ بھی کہہ ڈالو۔"

"پورے ڈیڑھ سو روپے ہوں گے۔ سوچ لو۔ سمجھ لو۔"

سانولے کہنے لگا "بائی جی یہ تو بہت ہے، اب رات تو سمجھو گزر ہی چکی ہے۔"

وہ اسی طرح سنجیدگی سے بولی "ہمارے ہاں بھاؤ تاؤ نہیں ہوتا۔ بس ایک بات ہے رقم رکھو اور مال اٹھاؤ۔"

سانولے اس کے انداز سے پھر بھی متاثر نہیں ہوا۔ ہنس کر بولا۔ "کہو تو اتنی لپے سیدھے ہاتھوں سے

تمھاری نذر کردوں۔" وہ منجھے ہوئے تماش بینوں کے انداز میں بات کر رہا تھا۔

عورت رضامند نہ ہوئی۔ کہنے لگی "ایک بار ہم نے کہہ دیا کہ بھاؤ تاؤ کرنا ہو تو کہیں اور چلے جاؤ۔ شہر میں بہت سے چکلے موجود ہیں۔" یا تو وہ اسی طرح بات کرنے کی عادی تھی یا ہم دونوں کا پھٹیچر حلیہ دیکھ کر اس طرح بات کر رہی تھی۔ لیکن وہ جس قدر طنطنے کا مظاہرہ کر رہی تھی، سانولے اسی قدر بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ وہ انکار کرتی رہی اور وہ اسکے ہر انکار پر پانچ روپے بڑھاتا گیا لیکن سو روپے پر بولی رک گئی

آخر جب کسی طرح سودا نہ پٹا تو ہم دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ سانولے نے واپسی پر دس روپے ہرجانے کے طور پر دینا چاہے تو نائکہ نے روپیہ لینے سے انکار کر دیا۔ زینے کے دروازے تک ہم دونوں کو پہنچانے آئی۔ نہ اس نے کسی خفگی کا اظہار کیا نہ ناک بھوں چڑھائی۔

سڑک پر آ کر ہم نے دیکھا کہ رکشا والا ابھی تک وہاں کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ کام بنا نہیں۔ قریب آ کر کہنے لگا۔

"اجی میرا تو پہلے ہی آپ لوگوں کو یہاں لانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ان سالیوں کے تو بڑے دماغ چڑھے ہوتے ہیں۔ پھر آج کل تو کہیں باہر کے فوجیوں کا جہاز آیا ہوا ہے۔ اس لیے ان کے نخروں میں اور بھی گرم مسالا پڑ گیا ہے، ان کی سچ پوچھیے تو جی آمدنی ہی ان سے ہے۔ سالیاں بالکل میمیں بن گئی ہیں ایک دم!" وہ سانولے کی کدورت دور کرنے کیلئے الٹی سیدھی ہانک رہا تھا کہ لگے ہاتھوں کچھ مل جائے تو اور اینٹھ لوں۔ سانولے واقعی کچھ نڈھال اور چپ چپ نظر آ رہا تھا۔ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"مار سالیوں کو گولی۔ چل تو ہم دونوں کو پرانی نمائش چھوڑ دے۔"

میں نے کہا، "سانولے میرا کہنا مانو تو تم جا کر ٹھہر جاؤ۔ میں تو اب کہیں جا کر پڑ رہوں گا۔ اس کے بجائے تم مجھے دس روپے دے دو"

مگر وہ آمادہ نہ ہوا۔ کہنے لگا "یار تم نے کمال کر دیا۔ بھئی حد ہو گئی۔ تم نے سانولے خاں کو اتنا نیچ کیوں سمجھ لیا۔ یار ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ اب تو جہاں جائیں گے ساتھ ہی جائیں گے" اور وہ اچک کر رکشا پر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر برابر بٹھاتے ہوئے بولا۔ "چلو اب چل کر کہیں سونے کا انتظام کرتے ہیں۔"

رکشا چل دیا اور سانولے خاں جھوم جھوم کر اپنی بے ڈھنگی آواز سے گانے لگا۔ اب وہ پھر فارم میں آ گیا تھا۔

پرانی نمائش کے پاس پہنچ کر اس نے رکشا والے کو ایک روپیہ دیا اور مجھے اپنے ساتھ لیے ہوئے

لکڑی کے ایک کیبن کے نزدیک پہنچ کر پکارنے لگا۔ "کلن! اماں کلن سو رہے ہو؟"

اندر سے کسی نے پوچھا۔ "کون ہے جی؟"

سانولے بے تکلفی سے بولا۔ "ابے بھسنڈ کے میں ہوں سانولے۔"

کلن کھانستا ہوا اٹھا اور دروازہ کھول کر بولا۔ "اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟"

سانولے کہنے لگا۔ "فی الحال تو تمھارے کیبن کے اندر سونے کا ارادہ ہے۔ سخت نیند آ رہی ہے"

کلن نے کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکا کر سوچنے لگا۔

سانولے نے ڈپٹ کر کہا۔ "ابے سوچ کیا رہا ہے۔ دروازے سے ہٹ میں اندر آ رہا ہوں۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "ٹھیر تو یار۔ اندر تیری بھابی لیٹی ہے۔"

سانولے نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ "ابے کیا تیری گھر والی آ گئی؟ سالے تم دونوں ہی بے غیرت ہو۔ کہاں تو کل تک طلاق طلاق ہو رہی تھی اور آج پھر کیبن آباد ہے۔"

کلن کہنے لگا۔ "اماں اب تم سے کیا کہوں سب نے مل کر۔ !"

اسی وقت اندر سے ایک عورت کی آواز ابھری۔ "یہ بھائی سانولے او دیکھو پھر انھوں نے وہی باتیں شروع کر دیں، جس کی نو سو دفعہ غرض پڑی تھی، وہ خوشامد کر کے لایا تھا۔ میں کسی کے پاس سفارش ۔"

کلن نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ "نیک بخت تو نے میری بات تو پوری سنی ہوتی۔"

مگر وہ بڑی تیز طرار عورت تھی۔ اس نے کلن کی ایک نہ سنی بس اپنی ہی کہتی رہی۔ سانولے نے دونوں کو ڈانٹا اور دس روپے کا ایک نوٹ کلن کو دے کر بولا۔ "میری طرف سے بچوں کو دے دینا۔"

کلن کہتا ہی رہا۔ "اماں پان تو کھا لو۔" مگر وہ وہاں نہ ٹھیرا۔

اب ہمارے سامنے پھر وہی مسئلہ تھا کہ رات کہاں کاٹی جائے۔ میں تو تھا ہی بے گھرا، مگر سانولے کا بھی کوئی ٹھور ٹھکانا نہ تھا۔

ہم دونوں آگے بڑھے۔ مگر زیادہ دور نہ گئے۔ سڑک کے کنارے رکشا والوں کا ایک اڈا تھا۔ یہاں چھوٹا سا الاؤ بھی دہک رہا تھا جس کے گرد رکشا والے بیٹھے تھے۔ پاس ہی سامان سنبھالے ایک چائے والا بھی موجود تھا۔ ہم دونوں نے اس سے چائے کی ایک ایک پیالی لی اور وہیں الاؤ کے پاس بیٹھ کر پینے لگے۔ اس وقت چائے نے بڑا مزہ دیا۔

سانولے کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا پھر کچھ سوچ کر بولا "چل یار ایک جگہ اور چلتے ہیں۔ یہاں اوس میں تو دونوں کا پلیتھن نکل جائے گا۔" اس بار بھی اس نے پوری بات نہیں بتائی۔ رکشا لیا اور دونوں چل دیئے۔

پٹیل پاڑے کی ایک سنسان گلی کے پاس اس نے رکشا رکوایا اور کرایہ دے کر گلی کے اندر گھس گیا ابھی چند ہی قدم کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ہمارے چہروں پر ٹارچ کی روشنی لہرائی اور کسی نے آہستہ سے پوچھا "کون؟"

سانولے شوخی سے بولا "پیا بالم"

اس دفعہ اس آدمی نے لہجہ پر زور دے کر کہا "ٹھیک سے بولو۔ کس کے پاس جانا ہے؟"

سانولے پر اس کے ڈپٹنے کا کوئی اثر نہیں ہوا برابر آگے بڑھتا گیا اور قریب جا کر بولا "ابے آج تیری ڈیوٹی ہے۔ سالے! اب اپنے چچا کو پہچانو گے بھی نہیں" اور اس نے فوراً سانولے کو پہچان لیا۔

"داماں خاں صاحب تم ہو۔ یار میں نے کہا اتنی رات گئے یہ کون آدھمکا"

سانولے پوچھنے لگا "کیا رنگ ڈھنگ ہے؟"

وہ بولا "آج بڑے زوروں کا معرکہ ہے"

وہ ہم دونوں کو ٹھہرا کر برابر والے مکان میں چلا گیا۔ واپسی پر ہم اس کے ہمراہ اندر پہنچ گئے یہ ایک لمبا کمرہ تھا۔ آمنے سامنے کی دو دیواروں کے طاقوں میں لیمپ روشن تھے۔ پھر بھی روشنی کچھ دھندلی دھندلی اور مٹیالی سی لگ رہی تھی۔ کمرے کی فضا تمباکو کے دھوئیں سے گھٹی ہوئی تھی۔ سامنے دری پر کئی آدمی بیٹھے تھے اور پاگلوں کی طرح بے تکان بول رہے تھے۔ بال بکھرے ہوئے۔ چہرے خوف ناک حد تک اجاڑ۔ اس گھٹی ہوئی فضا میں تاش بٹ رہے تھے اور داؤں لگ رہے تھے

اس قمار خانے کو دیکھ کر مجھے جتنی گھبراہٹ معلوم ہوئی، سانولے کا چہرہ اتنا ہی کھل اٹھا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ لیے ہوئے آگے بڑھا اور ہنستا مسکراتا جواریوں کے جمگھٹے میں شامل ہو گیا۔ جیب سے اس نے دس کا ایک نوٹ نکال کر رکھ دیا اور چلانے لگا۔

"دو روپے پر دہلا اندر"

برابر سے آواز آئی "پتہ مار کر دو روپے پر دہلا باہر"

سانولے بولا "اور لگاؤ۔ پورے پانچ کر لو"

اس شخص نے کہا "چلو یہ ہی سہی" پھر تاش بانٹنے والے سے بولا "پھینک دہلا باہر"

تاش برابر بٹتے رہے۔ سانولے نے ایک دوسرے جواری سے بھی داؤں لگایا۔ وہ اب بڑے تال سُر کے ساتھ کہہ رہا تھا "دہلا اندر۔ بنجر باہر" اتنے میں بانٹنے والے کے ہاتھ سے اینٹ کا دہلا نکل کر سامنے گرا۔ سانولے نے تاش اٹھایا اور بے اختیار اسے چوم لیا "ہے جیو میرے راجا" تھوڑی دیر بعد دوسرا داؤں بھی جیت گیا۔ اس نے جلدی سے سارے روپے سمیٹ کر سامنے کر لیے۔ ایک طرف سے آواز آئی۔

"ابے ذرا دیکھ کے، پہلی جیت منگائے بھیک"

سانولے نے گھور کے اس کی طرف دیکھا "دیکھ بے ہاتھ پر لات مت لے وہ لگاؤں گا جھانپڑ کہ بتیسی باہر نکل پڑے گی"

میرے لیے یہ سب کچھ دلچسپ بھی تھا اور حیرت انگیز بھی۔ جواری ہار رہے تھے اور جیت رہے تھے جیت رہے تھے اور ہار رہے تھے۔ سگریٹ اور بیڑی پر لمبے لمبے کش لگ رہے تھے۔ جس کے دھوئیں نے کمرے کی فضا دھندلی کر دی تھی۔ سانولے کچھ دیر تک تو مجھ سے کچھ نہ کچھ بات کرتا رہا۔ اس کے بعد کھیل میں وہ اس طرح الجھا کہ تن من کا ہوش نہ رہا۔ ادھر کچھ دیر تو جوئے کا یہ ہنگامہ مجھے اچھا لگا۔ لیکن رفتہ رفتہ دلچسپی کم ہوتی گئی اور نیند کا غلبہ بڑھنے لگا۔ مجھے خبر نہیں کہ کب سو گیا البتہ جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا، سانولے مجھے جھنجھوڑ کر جگا رہا تھا۔

"یار تُو تو گھوڑے بیچ کر سوتا ہے"

میں بڑی گہری نیند میں تھا۔ اس کا اس طرح جگانا بڑا شاق گزرا۔ بادلِ نخواستہ اٹھنا پڑا۔ کمرے کے اندر ابھی تک لوگوں کی ملی جلی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ تاش بٹ رہے اور روپے کھنک رہے تھے۔ لیکن سانولے نے پلٹ کر کسی طرف نہ دیکھا۔ مجھے ساتھ لیے ہوئے باہر آ گیا۔ اندھیری گلی عبور کر کے جب ہم دونوں سڑک پر پہنچے تو رات کا اندھیرا ابھی تک ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ بحیرۂ عرب سے آنے والی ہوائیں اور بھی زیادہ ٹھنڈی معلوم ہو رہی تھیں۔ سانولے اس وقت بالکل خاموش تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کے مجسمے کی طرح ٹھوس نظر آ رہا تھا۔ نہ اس پر دُکھ تھا نہ مسرت، البتہ اس کی آنکھیں اور بھی زیادہ سُرخ ہو رہی تھیں۔ چلتے چلتے میں نے خاموشی سے اکتا کر پُوچھا۔

"میں تو سو گیا تھا، بعد میں تمھارا کھیل کیسا رہا؟"

وہ کہنے لگا "تمھارے پاس کچھ ہو تو چل کر چائے پلا دو"

میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا "کیا سب ہار گئے؟ تم نے تو حد کر دی۔"

"چھوڑ یار! جوئے میں اور ہوتا کیا ہے۔ ہار یا جیت چل پہلے مجھے ایک چائے پلا۔ سالا سر میں درد ہو رہا ہے۔"

مجھے اس کی اس بات پر سخت تاؤ آیا۔ دل ہی دل میں کہا دس روپے مانگتا رہا تو سالا ہر بار ٹال گیا۔ اب جیب میں دو چار آنے پڑے ہیں، اس میں بھی ساجھا لڑا رہا ہے اور رات بھر جگا یا گھاتے میں۔ جوں جوں مجھے اس بات کا خیال آتا میرا غصہ اور بھی بڑھتا جاتا۔ اب ہم دونوں خوجہ جماعت خانے سے آگے بڑھ کر سولجر بازار جانے والی سڑک پر آ گئے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا اور کہر کا دھندلا دھندلا غبار۔ اور اس سُرمئی غبار میں سڑک کے دونوں طرف بنی ہوئی خوبصورت عمارتیں اُونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ کائنات کی ہر چیز خوابیدہ تھی صرف ہم دونوں جاگ رہے تھے جن کے لیے نہ سر چھپانے کا کوئی ٹھکانا تھا نہ کوئی منزل اور رات اتنی آہستہ چل رہی تھی جیسے کبھی ختم نہ ہوگی۔

اسی طرح بے تکی باتیں سوچتے سوچتے میں نے سانولے کی جانب دیکھا۔ وہ ابھی تک بت کی طرح خاموش تھا۔ مجھے اس وقت وہ بڑا غلیظ اور قابلِ نفرت معلوم ہوا۔ اگر میں اس کے ساتھ یوں ہی چلتا رہوں گا تو یہ نفرت اور بڑھتی جائے گی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا۔

"اچھا بھئی سانولے! میں تو اب ایک جگہ اور جاؤں گا۔"

میں سڑک کے ایک موڑ پر مڑنے لگا تو سانولے نے چونک کر کہا "یار! ایسی بات مت کہو، اب تم بھی اس کڑکی میں اپنا ساتھ چھوڑ دو گے۔ نہیں جی، یہ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے غور کیا۔ میری اس بات نے اس کو خاصا اداس اور دل شکستہ کر دیا تھا۔ مگر اب میں اس کے ساتھ زیادہ دیر ٹھیرنا نہ چاہتا تھا۔ آخر جب میں کچھ دور اس کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد ایک جانب مڑ گیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں نے بے رخی سے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور اس کے ہمراہ آگے جانے پر آمادہ نہ ہوا تو اچانک اس نے مجھے خونخوار نظروں سے گھور کر دیکھا اور بلی کی طرح جھپٹ کر میرا گلا دبوچ لیا۔ میں نے اس کی گرفت سے چھوٹنے کے لیے اس کے لمبے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیے اور اس طرح ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

سڑک بالکل سنسان تھی۔ اونچی اونچی عمارتیں خوابیدہ تھیں۔ رات اژدھے کی طرح رینگ رہی تھی اور ہم دونوں ایک دوسرے کو وحشیانہ انداز سے مار رہے تھے۔ لوُچ کھسوٹ رہے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں سانولے کو گرا کر اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور تابڑ توڑ گھونسے مارنے لگا۔ اس نے جل کر مجھے دو تین گالیاں دیں اور نہ جانے کس طرح شلوار کے نیفے سے لوہے کی وہ سلاخ نکال لی جس کو وہ کمائی کا ٹھیکرا کہا کرتا تھا۔ اس نے سلاخ میری کمر میں اُڑا کر جا بجا گوشت کے اندر اتار دی۔ لیکن میں نے سلاخ جھٹ سے چھین کر ایک طرف پھینک دی۔ ایک بار پھر میں نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ مارتے مارتے میرا دم پھول گیا۔ آخر اس نے نیچے سے زور کیا اور مجھے گرا دیا۔ میں لوہے کی سلاخ اُٹھانے کے لیے لپکا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑا۔ سانولے سے بھی اُٹھ کر اس طرف بڑھا نہیں گیا۔

ہم دونوں بھینسوں کی طرح ہانپ رہے تھے، منہ کھلے تھے اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ چہرے خاک میں لتھڑے ہوئے تھے۔ رات کے پچھلے پہر سنسان سڑک پر ہم بھوتوں کی مانند خوفناک نظر آ رہے تھے۔ ہانپتے ہانپتے میں وہیں لیٹ گیا اور نڈھال ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

ذرا دیر بعد میں نے دیکھا۔ سانولے برابر بیٹھا میری پیٹھ سہلا رہا تھا۔ اس نے رسان سے کہا "ناک سے سانس لو، ناک سے۔" اس کے لہجے میں شفقت تھی۔ میری طبیعت اب ذرا سنبھل چکی تھی۔ مجھ سے ایک لفظ نہ کہا گیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے گردن جھکائے خاموش بیٹھا دیکھ کر وہ بولا "اُٹھ یار، اب عورتوں کی طرح کب تک نخرے کرے گا۔" اس نے میرا بازو پکڑ کر کھڑا کر دیا اور کندھا تھپتھپا کر بولا۔

"آدمی تو بھی کس بل کا ہے، مزہ آ گیا۔ پر یار کپڑے پھٹ گئے۔ یہ برا ہوا۔"

میں کچھ اس قدر خفیف ہو رہا تھا کہ اس بار بھی مجھ سے کچھ کہا نہ گیا۔ مگر وہ اسی طرح بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی خم دار سلاخ دبی تھی۔ اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا "استاد گھبرائے کیوں جا رہے ہو۔ ابھی تو رات ہے۔ چلو کہیں موقع لگاتے ہیں۔ فکر کاہے کی، جیب تو ہے تو کیا غم۔"

مجھ سے انکار کرتے نہ بن پڑا اور میں اس کے ہمراہ ایک ویران سڑک پر مڑ گیا۔

کچھ دور تک ہم دونوں یوں ہی چلتے رہے پھر ایک ایسا مقام آ گیا جہاں اندھیرا بہت گہرا تھا ہر سو ہو کا عالم تھا۔ سانولے نے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا گھوم پھر کر سن گن لی اور بندر کی طرح اچھل کر ایک بنگلے کی چار دیواری پر چڑھ گیا۔ ہاتھ پکڑ کر اس نے مجھے بھی اوپر چڑھا لیا۔ یہ پرانی وضع کا بنگلہ تھا اور گھنے

درختوں سے ڈھکا ہوا بجائیں بجائیں کر رہا تھا۔

سانولے خاں آہستہ سے پھسل کر نیچے اُتر گیا اور اُن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ اندھیرے کا جال اسی طرح پھیلا رہا۔ اچانک رات کے سناٹے میں کتے کے زور زور سے بھونکنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی سانولے خاں کی دل دوز چیخیں ابھریں۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں جھٹ سے کود کر سڑک پر آ گیا اور سرپٹ بھاگنا شروع کر دیا۔

اس روز کے بعد سے آج تک سانولے خاں کو میں نے نہیں دیکھا، خدا معلوم جیل میں ہے یا ابھی تک آوارہ گرد کتوں کی طرح راتوں کو گھومتا پھرتا ہے۔

ہفتے کی شام

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی وہ اندر آگئی۔ پہلے اس نے کمرے کا جائزہ لیا پھر دالان کی طرف دیکھنے لگی۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ باہر اب اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "بھابی ہیں؟" میں نے جواب دیا۔

"جی نہیں! وہ اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں گئی ہیں۔ کل واپس آئیں گی۔"

وہ ذرا دیر چپ چاپ کھڑی کچھ سوچتی رہی، پھر دروازے کی جانب مڑتے ہوئے بولی "اچھی بات ہے" لیکن وہ کمرے سے باہر نہ گئی۔ دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گئی۔

اس دفعہ اس نے میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھا "آج ان کے آنے کا کوئی امکان نہیں؟ ان سے ایک ضروری کام تھا۔"

میں نے کہا "نہیں، آج وہ نہیں آسکیں گی۔"

لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد وہ بولی "آپ اس وقت میرے لیے پچاس روپے کا بندوبست کرسکیں گے؟"

میں تذبذب میں پڑ گیا۔ روپے تو میرے پاس تھے۔ لیکن وہ اپنی ضرورت کے لیے تھے قرض دینے کے لیے نہیں تھے۔ میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایسی کوئی علامت نہیں تھی جسے دیکھ کر ہمدردی یا خدا ترسی کا کوئی جذبہ پیدا ہو۔ وہ خاموش کھڑی میرے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ مجھ سے انکار کرتے نہ بن پڑا۔ میں نے چپ چاپ اٹھ کر سوٹ کیس کھولا۔ پچاس روپے نکالے اور اسے دے دیئے۔ اس نے روپے لے کر شکریہ ادا کیا۔ انگلی سے انگوٹھی اتاری اور سامنے میز پر ڈال دی۔

"اسے رکھ لیجیے۔ میں ۱۲ر تاریخ کو واپس لے جاؤں گی۔"

اس کی یہ حرکت مجھے کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ میں نے کہا "اس کی کیا ضرورت ہے۔ روپے جب جی چاہے واپس کر دیجیے گا۔" میں نے انگوٹھی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔ لیکن وہ اسے واپس لینے پر آمادہ نہ ہوئی۔ میں نے جب زیادہ اصرار کیا تو کہنے لگی۔

"اچھا تو پھر یہ روپے رکھ لیجیے۔ میں کہیں اور سے انتظام کر لوں گی۔"

آخر مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ حالانکہ اس کی یہ حرکت کچھ اچھی نہیں لگی۔

وہ جس طرح خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئی تھی اسی طرح باہر چلی گئی۔ میں نے انگوٹھی اٹھا کر دیکھی۔ اچھی خوب صورت وضع کی بنی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ لڑکی کا مذاق بڑا ستھرا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میری اس سے اس طرح بات چیت ہوئی۔ یوں وہ میرے گھر میں اکثر آیا جایا کرتی تھی۔ میں اس محلہ میں نووارد تھا لہذا پاس پڑوس کے لوگوں کے متعلق میری معلومات کچھ زیادہ نہیں تھیں۔ مجھے اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ سرکاری کوارٹروں کی دوسری جانب میدان میں مہاجرین کی جو جھگیاں تھیں، انھی میں سے کسی میں وہ رہتی تھی۔ اس کے گھر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے مردوں کے زمرے میں شامل کیا جائے۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جو مشکل سے دس سال کا ہوگا۔ اس کے علاوہ دو چھوٹی بہنیں تھیں اور ماں۔ باپ اور بڑا بھائی فسادات میں مارے گئے تھے۔ ماں اور بہنیں پردہ کرتی تھیں۔ شروع شروع میں جب وہ یہاں آئی تھی تو برقع پہن کر باہر نکلتی تھی۔ ادھر کچھ مدت سے برقع اتار کر رکھ دیا تھا۔ گھر بھر کا خرچ کیسے چلتا تھا۔ یہ ایک راز تھا۔ کسی کو اس کا علم نہیں۔ اس کی ماں کہتی تھی کہ لاہور میں لڑکی کا ایک ماموں رہتا ہے، جو روپے پیسے سے وقتاً فوقتاً ان کی مدد کرتا رہتا ہے۔

یہ باتیں بھی مجھے اس طرح معلوم ہوئیں کہ میں جس کوارٹر میں رہتا ہوں وہ ایک سرکاری ملازم کے نام الاٹ ہے۔ تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ لہذا اس نے یہ کوارٹر مجھے کرائے پر دے دیا اور خود علاحدہ جھگی ڈال کر سامنے میدان میں رہنے لگا۔ تاکہ کبھی اسٹیٹ آفس والے اگر تحقیقات کریں تو فوراً کوارٹر میں پہنچ کر یہ ثابت کرسکے کہ وہ خود یہاں رہتا ہے۔

ذرا دیر بعد میں سگریٹ خریدنے باہر گیا تو پروویژن اسٹور کے پاس نیاز صاحب مل گئے۔ وہ میرے پڑوس ہی میں رہتے ہیں۔ کسی دفتر میں ہیڈ کلرک ہیں۔ ادھیڑ عمر کے آدمی ہیں معاشرہ کی اصلاح

کے زبردست حامی ہیں۔ محلہ میں انھوں نے اصلاح المسلمین کے نام سے ایک انجمن بھی قائم کر رکھی ہے۔ ہر اتوار کو باقاعدگی سے اس کے اجلاس ہوتے ہیں۔ محلّے کے بہت سے رہنے والے اس انجمن کے ممبر ہیں۔ ان ہی کے کوارٹر کے ایک حصّہ میں انجمن کا دفتر ہے اور اسی میں ایک چھوٹا سا دارالمطالعہ بھی ہے۔ نیاز صاحب انجمن کے صدر بھی ہیں۔ اس علاقے میں رہنے والے سب ہی ان کی عزت کرتے ہیں۔ اس روز مجھ پر وہ کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آتے تھے۔ بڑے سرپرستانہ انداز میں مشورے دیتے رہے۔ سیاست پر وہ بہت کم بات کرتے ہیں۔ (غالباً سرکاری ملازم ہونے کے باعث) البتہ اخلاقی زبوں حالی کا ان کو بڑا قلق ہے، چنانچہ اخلاقیات کا درس دے رہے تھے۔ بات کرتے کرتے اچانک مجھ سے پوچھنے لگے۔

"یہ عورت عائشہ، جو نیم کے پیڑ تلے رہتی ہے، آپ سے اس کی کب سے جان پہچان ہے؟"

میں نے کہا "جب سے یہاں آیا ہوں، اسی وقت سے گھر میں آنے جانے لگی ہے"

کہنے لگے "دیکھئے اس کا اس طرح آپ کے گھر میں آنا جانا مجھے قطعی پسند نہیں۔ وہ محلّے میں کچھ نیک نام نہیں اور آپ ٹھہرے عزت دار آدمی۔ ایسی عورتوں کو زیادہ منہ لگانا ٹھیک نہیں۔"

اگرچہ عائشہ میں مجھے ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی۔ لیکن میں ذرا دبّو آدمی ہوں۔ کسی سے الجھنے کی مطلق کوشش نہیں کرتا۔ لہٰذا میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ "آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ میں خود بھی اسے اچھا نہیں سمجھتا"

کہنے لگے "اچھا سمجھنے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ فوراً گھر میں تاکید کر دیں اور اس کا آنا جانا بالکل بند کر دیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں سے ملی ہوئی ہے۔ اسی طرح گھروں کے اندر جا جا کر ٹوہ لگاتی ہے اور پھر چوری کروا دیتی ہے۔ جب سے یہ یہاں آئی ہے۔ کئی کوارٹروں میں نقب زنی اور چوری کی وارداتیں ہو چکی ہیں"

میں نے چہرے پر زبردستی حیرت کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا "اچھا! تو یہ اتنی خطرناک لڑکی ہے۔ مجھے تو اس کے بارے میں کبھی ایسا وہم و گمان بھی نہیں ہوا!"

وہ فوراً بولے "اسی لیے تو میں نے عرض کیا کہ اس کا آنا جانا بند کرا دیجیئے۔ آپ خود غور کیجیئے کہ گھر میں کوئی مرد موجود نہیں۔ چار پانچ آدمیوں کا کنبہ ہے۔ آخر اتنے بڑے کنبے کا خرچ کس طرح چلتا

ہے۔ پھر یہ دیکھئے کہ کس ٹھاٹھ سے رہتی ہے۔ کوئی دیکھے تو یہی کہے کہ کسی بڑے گھرانے کی عورت ہے۔"

ان کی یہ بات البتہ قابل توجہ تھی کہ عائشہ رہتی بڑی سج دھج سے تھی۔ جدید وضع کے ترشے ہوئے بال۔ صاف ستھرا، سلیقہ سے سلا ہوا لباس۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ۔ خاصی طرحدار لڑکی تھی۔ اس کے سامنے محلہ کے کلرکوں کی بیویاں، منہ بسورتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

نیاز صاحب میرے دروازے تک باتیں کرتے کرتے آگئے۔ وہ برابر عائشہ کی برائیاں کرتے رہے۔ اسے ہر طرح خطرناک اور بدکردار ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن ایک بات میں نے غور کی اور وہ یہ تھی کہ وہ عائشہ کا تذکرہ لڑکی کے بجائے بار بار عورت کہہ کر کرتے تھے۔ حالانکہ عائشہ کا سن ان کی بڑی بیٹی سے زیادہ نہ ہوگا۔

بہرحال عائشہ کا خطرناک اور آوارہ ہونا میرے لیے ایک انکشاف ضرور تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے متعلق اور بھی بہت سے انکشافات ہوئے۔

مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ کوارٹروں میں رہنے والے عائشہ کے متعلق بڑی خراب رائے رکھتے ہیں۔ نفرت اور بدگمانی کے باوجود ہر شخص اس کے ذکر میں دل چسپی کا اظہار ضرور کرتا۔ ویسے عائشہ کے بارے میں ہر ایک کی جداگانہ رائے ہے۔ مثلاً فدا احمد جس کا کوارٹر بالکل میری دیوار سے ملحق ہے، اس کا خیال ہے کہ عائشہ کا ذریعہ معاش بلیک میلنگ ہے۔ اس سلسلہ میں وہ شہر کے ایک سیاسی لیڈر کا نام بھی لیتا ہے (کم از کم میرے لیے کسی ایسے نام کا اظہار کسی طرح بھی خطرے سے خالی نہیں)۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک زمانہ میں عائشہ کی ان سے آشنائی تھی، پھر آپس میں ان بن ہو گئی۔ لیڈر کچھ اس طرح اس پر فریفتہ تھے کہ انھوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے کتنے ہی عاشقانہ خطوط لکھ ڈالے۔ یہ خطوط ابھی تک عائشہ کے پاس موجود ہیں۔ اب وہ تو کسی اور لڑکی میں دل چسپی لے رہے ہیں۔ لیکن یہ خطوں کی دھمکی دے کر ان سے کچھ نہ کچھ رقم اینٹھ لاتی ہے۔ فدا احمد کے بیان میں کس قدر صداقت ہے۔ اسے وہی بہتر سمجھ سکتا ہے یا عائشہ جانتی ہے۔ البتہ میں فدا احمد کے متعلق صرف اسی قدر جانتا ہوں کہ وہ ٹائپسٹ ہے۔ معمولی تنخواہ ملتی ہے۔ کنبہ بڑا ہے۔ اس لیے دفتر کے اوقات کے علاوہ کچھ پارٹ ٹائم دھندا بھی کرتا ہے۔ یہ مکانوں کو پگڑی پر اٹھانے کا کاروبار ہے۔ اس دلالی سے اب تک اتنی آمدنی ہو چکی ہے کہ وہ ایک پلاٹ لے کر اس پر مکان بنوانے کے متعلق منصوبہ بنا رہا ہے۔

لیکن صفدر خاں، جو فدا احمد ہی کے دفتر میں کام کرتا ہے، قسمیں کھا کھا کر کہتا ہے کہ عائشہ الفنسٹن اسٹریٹ کی ایک دکان پر سیلز گرل ہے اس نے خود اسے دکان پر کام کرتے دیکھا ہے۔ بلکہ ایک آدھ بار اس سے کچھ سامان بھی خرید کر لایا ہے۔ فدا احمد کی بات سے اسے صرف اختلاف ہی نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی تو جھنجھلا کر گالیاں دینے پر اُتر آتا ہے۔ وہ عائشہ کی حمایت میں اکثر محلّے والوں سے بھی لڑ چکا ہے۔ ایک بار تو اس نے مجھے اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ سب لوگ عائشہ سے اس لیے جلتے ہیں کہ وہ کسی کو منہ نہیں لگاتی۔ شروع شروع میں جب وہ یہاں آئی تھی تو ہر شخص اس کے خاندان سے ہمدردی جتاتا تھا۔ خود نیاز صاحب نے انجمن اصلاح المسلمین اسی غرض سے قائم کی تھی پہلے اس کا نام اصلاح مہاجرین تھا جس کے ذریعہ نیاز صاحب نے محلّے بھر سے چندہ جمع کیا۔ دفتر کے لیے اپنا کمرہ دیا۔ عائشہ کو انھوں نے شعبۂ خواتین کا سیکرٹری چنا۔ ان دنوں ان کے گھر میں عائشہ کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔ پھر نہ جانے کیوں وہ اس سے سخت ناراض ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی مہاجرین کی امداد کی تحریک بھی ختم ہو گئی اور انجمن اصلاحِ مہاجرین کے بجائے ان کے کوارٹر پر اصلاح المسلمین کا بورڈ نظر آنے لگا۔ پہلے وہ اسے بہت ذہین اور صاحب کردار کہتے تھے۔ اب آوارہ اور خطرناک بتاتے ہیں۔ صفدر خاں یہ سب کچھ اس لیے کہتا ہے کہ خود اس کی ایک بہن کسی دفتر میں ٹائپسٹ ہے۔ علاوہ اس کے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ جس طرح عائشہ کے لیے سب کو برا بھلا کہتا رہتا ہے اس کی اطلاع کسی نہ کسی طور اسے بھی پہنچ جاتی ہوگی۔ اس طرح وہ اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

صفدر خاں کی طرح عائشہ کا ایک اور بھی ہمدرد ہے۔ اس کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ اُسے بہن کی طرح سمجھتا ہے۔ یہ پستہ قد، منحنی جسم کا ایک کلرک ہے۔ اس کا نام انوار ہے۔ عائشہ کے متعلق اس کا بیان سب سے مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عائشہ بہت نیک اور محنتی لڑکی ہے۔ بے چاری لاوارث ہے۔ جن دنوں وہ یہاں آئی تھی، سارا خاندان فاقوں پر فاقے کر رہا تھا۔ آخر اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعہ کسی فرم میں ملازمت دلوا دی۔ اس کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ گھر گھر جا کر یہ تحقیقات کرتی ہے کہ لوگ کون سا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے پاس ایک سوال نامہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ معلومات حاصل کرتی ہے۔ اس طرح کمپنی یہ جاننا چاہتی ہے کہ پاکستان میں ٹوتھ پیسٹ کی کتنی کھپت ہے تاکہ وہ اس کے مطابق حکومت سے یہ مطالبہ کرے کہ اسے زیادہ

مال امپورٹ کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن صفدر خاں کی طرح وہ عائشہ کے لئے خم ٹھونک کر لڑنے مرنے پر تیار نہیں ہو جاتا۔

وہ ایک خاموش کارکن کی طرح اس کی بھلائی کا خواہاں ہے۔ پرسوں کے واقعہ کے بعد میرا خیال ہے کہ انوار بھی اپنی رائے بدل دے گا۔ ہوا یہ کہ جس بس سے میں دفتر جا رہا تھا اس میں انوار بھی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ صدر کے قریب ایک بس اسٹینڈ پر اس نے عائشہ کا ٹکٹ بھی خرید لیا لیکن ذرا دیر بعد جب کنڈیکٹر نے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا "آپ کا ٹکٹ پیچھے لیا جا چکا ہے۔" تو عائشہ نے مڑ کر انوار کی طرف دیکھا اور جھنجھلا کر کنڈیکٹر سے بولی "جی نہیں میں اپنا ٹکٹ خود لوں گی"۔ میں نے دیکھا انوار کا چہرہ خفت سے سفید پڑ گیا تھا۔ خیریت یہ ہوئی کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا ورنہ وہ اور خفیف ہوتا۔

عائشہ نے جو کچھ کیا وہ درست تھا یا غلط اور انوار نے جو حرکت کی تھی وہ کس جذبہ کے تحت تھی، یہاں اس سے بحث نہیں۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ٹوتھ پیسٹ کی کھپت کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے کے سلسلہ میں اس نے عائشہ کی جس ملازمت کا ذکر کیا تھا وہ تھی خوب۔ کچھ انوکھی بھی اور حیرت انگیز بھی۔

لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات جس شخص نے بیان کی وہ خود بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ میں اسے آرٹسٹ کہوں تو بے جا نہ ہوگا۔ حالانکہ وہ اس بات پر مصر ہے کہ اُسے انٹلکچوئل سمجھا جائے۔ حال اس کا یہ ہے کہ سیاست پر بات کریں تو سیاست دان، فلسفہ پر بات کریں تو فلسفی، سائنس کی بات کریں تو سائنس دان۔ غرضیکہ وہ اچھا خاصہ تجریدی فن کا نمونہ ہے کہ آپ جس عنوان سے چاہیں اسے یاد کر سکتے ہیں۔ اس کی شخصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

وہ پائپ کا کش لگا کر لوگوں کو اس طرح مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے جیسے ابھی عقیدت سے سب کے سر اس کے سامنے جھک جائیں گے۔ لیکن دن بھر فائیلوں سے الجھنے والے دفتری قسم کے لوگ، اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوتے۔ وہ اسے انٹلکچوئل کے بجائے الو کا پٹھہ سمجھتے ہیں۔ یہی بے چارے کے ساتھ ٹریجڈی ہے۔ سابقہ اس کا پاکستانیوں سے ہے (جو پس ماندہ قوم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں) اور رکھ رکھاؤ فرانس کے آرٹسٹوں کا سا ہے جہاں مشہور بنگالی مصور زین العابدین کی "بھینس" کی دم میں پھندنا نہیں بلکہ بتی باندھ کر تصویر کو مکمل کیا جاتا ہے۔

بہرحال ایک دن مجھے وہ آرٹسٹ مل گیا۔ بڑی اونچی اونچی باتیں کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں عائشہ

سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ آرٹسٹ نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگا "میں اس لڑکی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ صاحب اس کی چال میں کیا ردھم ہے۔" مجھے اس طرح راستہ میں کھڑے ہو کر کسی نوجوان لڑکی کو دیکھنا بڑا معیوب معلوم ہوا۔ ابھی اس نے چال میں ردھم دیکھا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں آرٹسٹک موڈ میں سر تال نہ دینا شروع کر دے۔ وہ ٹھہری تیز طبیعت کی لڑکی۔ آرٹسٹ تو سر تال ہی دیتا رہ جاتا اور وہ اسے تگنی کا ناچ نچانا شروع کر دیتی۔

خیریت ہوئی کہ وہ حد سے آگے نہ بڑھا۔ جب وہ چلی گئی تو مجھ سے مخاطب ہو کر بولا "بڑا پرفیکٹ ماڈل ہے۔ اس ملک میں کسی چیز کی قدر نہیں۔ بھلا غور تو کیجیئے کہ کسی آرٹسٹ کا اس قدر اعلیٰ ماڈل اور اسے تختۂ مشق بنایا جائے کاروباری مقاصد کے لیے۔" بات چونکہ میری سمجھ میں پوری طرح نہیں آئی تھی، لہٰذا میں نے پوچھا۔

"کاروباری مقاصد سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "او ہو، آپ غلط سمجھے۔ میں اس کے چال چلن کے متعلق کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ غالباً آپ کو علم نہیں، یہ لڑکی ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں کام کرتی ہے۔ وہاں اسے ماڈل بنا کر اشتہارات تیار کیئے جاتے ہیں۔ یہی جو آپ نے لائف بوائے صابن اور ڈالڈا گھی کے دیکھے ہیں۔ اس بے چاری کو کبھی ماں، کبھی بیوی اور کبھی نوکرانی کے روپ میں پبلسٹی کی غرض سے پیش کیا جاتا ہے۔" اس کی بات سن کر میں چونک پڑا۔ یہ ماڈل کی بھی خوب رہی۔

محلّے میں اسی طرح لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کیا کرتے۔ لیکن عائشہ سب سے بے نیاز، خاموشی سے ان کے سامنے سے گزر جاتی۔ اس آن بان سے کہ سب دیکھتے رہ جاتے۔ لیکن میں نے غور کیا کہ اس کے خلاف نت نئے اسکنڈل تیار کرنے والوں میں ایّوب سب سے پیش پیش تھا۔ بظاہر وہ بڑا ہنس مکھ اور زندہ دل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اچھا لباس پہنتا ہے۔ بہترین سگریٹ پیتا ہے اور عام طور پر ٹیکسی میں آتا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی محض ایک کلرک ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ اسکی سسرال والے بڑے مال دار ہیں۔ اسکی بیوی وہیں رہتی ہے۔ اور وہ خود کوارٹر میں تنہا رہتا ہے۔

صفدر خاں نے، جو مکانوں کی دلالی بھی کرتا ہے، اُس سے کہا بھی کہ کوارٹر کا آدھا ہی حصہ کرایہ پر اٹھا دو۔ مگر وہ قطعی راضی نہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کئی کئی روز اس کے کوارٹر میں تالا پڑا رہتا یا

کبھی کبھار اس کا کوئی دوست وہاں آکر ٹھہر جاتا۔ البتہ اس کی بیوی ہفتہ میں ایک آدھ بار وہاں ضرور آتی تھی۔ مگر وہ بھی رات بھر کے لیے۔ ویسے ایوب اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ کبھی مل جاتا تو بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا۔ لیکن جہاں عائشہ کا ذکر آیا، ایوب نے اس کی مٹی پلید کر کے رکھ دی۔ بات بات پر وہ اسے آوارہ اور بدچلن کہتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نہ تو میں عائشہ کو خطرناک اور آوارہ سمجھ سکا۔ اور نہ ہی اس کے بے عیب اور بے داغ ہونے پر یقین آیا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ مجھے بھی کچھ عجیب و غریب لڑکی معلوم ہوئی۔

اس روز بھی کچھ ایسا اتفاق ہوا۔ میں گھر میں تنہا تھا کہ وہ آگئی۔ آتے ہی اس نے پچاس روپے نکالے اور میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے روپے لے کر تکلفاً ایک آدھ جملہ کہا۔ اور غور سے اس کی جانب دیکھا۔ بظاہر وہ کسی طرح بھی عجیب و غریب نہیں معلوم ہوتی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح بات کرنے میں حجاب محسوس کر رہی تھی۔ بلکہ تنہا ہونے کے خیال سے کچھ گھبرائی ہوئی بھی معلوم ہو رہی تھی۔ میں بات کرنے کے موڈ میں تھا۔ لیکن اس نے ایسا موقع ہی نہیں دیا۔

"انگوٹھی واپس دیجیے گا؟"

میں چپ چاپ اٹھا اور انگوٹھی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور فوراً چلی گئی۔ میں نے غور کیا کہ اس روز ۲۱ ، تاریخ ہی تھی۔

انھی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک روز جب دفتر سے لوٹا تو میں نے دیکھا کہ وہ میری بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ باتیں کچھ گھریلو پریشانیوں اور مہنگائی کے متعلق تھیں۔ میں نے اس سے یوں ہی پوچھ لیا۔

"یہ تو بتائیے۔ کیا آپ کسی دفتر میں ملازم ہیں؟"

وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ پھر اس نے خفیف ہونے کے انداز میں کہا "دفتر میں کام کرنے کے قابل ہوتی تو پھر بات ہی کیا تھی۔ ہمارے ابّا نے ہمیں اتنی تعلیم ہی کب دلوائی۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر آوارہ اور بے لگام ہو جاتی ہیں۔ مرتے دم تک ان کا یہی خیال تھا۔" وہ خاموش ہو گئی۔

دراصل میں جو بات پوچھنا چاہتا تھا وہ اب بھی نہ کہہ سکا تھا۔ آخر میں نے جھجکتے ہوئے دبی

زبان سے اس کا بھی اظہار کر دیا۔ "تو آخر یہ آپ لوگوں کا خرچ کس طرح چلتا ہے؟"

اس دفعہ وہ مسکرا دی۔ "آج میرے متعلق آپ اتنی بہت سی باتیں جاننے کے لیے اتنے پریشان کیوں ہیں۔ خیریت تو ہے؟" میں کچھ کھسیانہ سا ہو گیا۔

"یوں ہی۔ میرا خیال ہے اس میں کوئی بری بات تو نہیں۔"

وہ بتانے لگی: "پہلے ہم لوگ جب یہاں آئے تھے تو ہمارے ایک ماموں تھے۔ وہ کچھ نہ کچھ مدد کر دیا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔" وہ کچھ اداس ہو گئی۔ "آج کل کے زمانہ میں کون کسی کی مدد کرتا ہے۔ آخر جب بہت برے دن آ گئے تو اماں نے یہ کیا کہ پاس پڑوس سے، پڑھے لکھے آ گئیں۔ ہم سب بہنیں مل کر سی ڈالتیں۔ کچھ عرصہ تک اسی طرح کام چلتا رہا۔ اب میں نے یہ کیا ہے کہ کوٹھیوں اور بنگلوں میں جا کر خود سلائی کے آرڈر لے آتی ہوں۔ بہت سی گھریلو عورتیں درزیوں کو ناپ دیتے ہوئے شرماتی ہیں۔ اس لیے ہم کو اچھا خاصا کام مل جاتا ہے۔ مشینیں خریدنے کے لئے کچھ روپے ہو جائیں تو میں باقاعدہ درزی خانہ کھول لونگی۔" اس نے بڑی سادگی سے ساری بات کہی تھی، جس پر شبہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ عائشہ کی آمدورفت اسی طرح میرے گھر میں جاری رہی۔ لوگوں کی مخالفت کے باوجود میں نے اس سے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس کے بعد محلّے میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں۔

فدا احمد کی شادی ہو گئی۔ وہ اب زیادہ تر گھر ہی میں رہتا۔ عائشہ کی حمایت میں لوگوں سے الجھنے کا اُسے موقعہ ہی نہیں ملتا۔ آرٹسٹ قسم کا نوجوان انٹلکچوئل سے اچانک بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بن گیا۔ نیاز صاحب کے متعلق لوگوں میں چرچے شروع ہو گئے تھے کہ انجمن نے جو فنڈ مہاجرین کے لیے اکٹھا کیا تھا، عرصہ سے اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ملا۔ بلکہ یہاں تک کہا جا رہا تھا کہ اس رقم سے انھوں نے اپنے منجھلے لڑکے کو جوتوں کی دکان کھلوا دی تھی جسے اس نے کچھ ریس کورس میں اور کچھ بالاخانوں پر نچھاور کر دیا۔

لیکن یہ ساری باتیں دبی دبی زبان سے کہی جا رہی تھیں۔ پھر ایک روز رات گئے محلہ بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ پولیس نے صفدر خاں کے گھر پر چھاپہ مار کر کچھ جواریوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ صفدر خاں پولیس کی حراست میں کھڑا اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہا تھا۔

عائشہ کی جانب سے لوگوں کی توجہ ہٹ کر اب ان ہنگاموں پر لگ گئی تھی۔ ہر طرف انھی کا چرچا تھا۔ عائشہ جو پہلے بڑے اہتمام سے نکلتی تھی، اب اس میں بھی بڑا فرق آ گیا تھا۔ اب اس کی چال میں نہ پہلی سی آن بان تھی اور نہ چہرے پر آب و تاب۔ جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ دکانوں پر کھڑے ہوئے لوگ اس کے متعلق جو گفتگو کیا کرتے تھے، اس کا اُسے پورا پورا احساس ہے۔ لیکن اب وہ نکلتی تو کوئی نوٹس نہ لیتا۔ اسے دیکھ کر مختصر سے بازار میں اس سرے سے اس سرے تک کوئی کھلبلی نہ مچتی۔

اچانک وہ بالکل غائب ہو گئی۔ لوگوں میں پھر اس کا چرچا شروع ہو گیا۔ کوئی پندرہ بیس روز بعد وہ نظر آئی تو بہت کمزور معلوم ہو رہی تھی۔ چہرے پر زردی تھی اور جسم مرجھایا ہوا لگتا تھا۔ اب اس کے گھر میں ایک بچے کے رونے کی آواز بھی سنائی پڑتی تھی۔ ایوب نے جو ہمیشہ اس کے خلاف کوئی نہ کوئی اسکنڈل کھڑا کیا کرتا تھا، بڑے دعوے سے کہا: "دیکھئے میں نہ کہتا تھا کہ یہ سالی ایک نمبر حرافہ ہے۔ اسپتال میں حرام کا بچہ جن نے گئی تھی۔ اب تو اسے گود میں لے کر بھی نکلتی ہے۔" یہ بات اس نے غلط بھی نہیں کہی۔ میں نے خود دیکھا کہ وہ ایک ننھے سے بچے کو گود میں لے کر غالباً ڈاکٹر کے یہاں جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ پھر مجھے اپنی رائے تبدیل کرنا پڑی۔

کچھ عرصہ بعد کا ذکر ہے۔ ایک رات اس کا چھوٹا بھائی آیا۔ کہنے لگا۔ "باجی نے بلایا ہے۔" میں نے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر دیا۔

ذرا دیر بعد پھر آیا۔ کہنے لگا کہ کھڑے کھڑے ایک بات سن کر چلے جائیے گا۔ بادل نخواستہ مجھے جانا پڑا۔ اس کے گھر میں جانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ یہ مٹی کی بنی ہوئی دیواروں کا گھروندا تھا۔ پرانے ٹین اور پھوس کی چھت تھی۔ اندر جا کر میں نے دیکھا کہ آگے دالان تھا اور اس کے پیچھے ایک کوٹھری تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"آخر آپ ہی آ گئے۔"

میں نے جواب دیا۔ "پہلے یہ بتائیے خیریت تو ہے۔"

وہ کہنے لگی: "آپ سے ذرا کام تھا۔ بات میں بعد کروں گی۔ آپ چائے پی لیجیے۔"

رات کے دس بجے چائے پینے کا کوئی موقع و محل نہیں تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ وہ جھٹ سے بول پڑی: "اچھا یہ بتائیے کہ آپ سگریٹ کون سی پیتے ہیں۔" پھر میرے

جواب کا انتظار کیے بغیر اُس نے اپنے بھائی سے کہا۔

"دیکھو جمیل! اماں سے پیسے لے کر سگریٹ لے آؤ۔ کہنا جو سب سے بڑھیا سگریٹ ہو وہی دینا۔" اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ "قینچی مارکہ سگریٹ ٹھیک رہے گی نا؟" اور پھر اس نے وہی سگریٹ لانے کی ہدایت کی۔

مجھے بڑھیا سگریٹ کے اس انتخاب پر کچھ ہنسی بھی معلوم ہوئی۔ مگر ضبط سے کام لیا۔ مُبادا اس کی دل آزاری ہو۔ منع بھی کیا لیکن اس نے سگریٹ منگوا ہی لی۔

ذرا دیر بعد چائے آ گئی۔ اس کے ساتھ سستے قسم کے بسکٹ بھی تھے۔ میں پیٹ کا یونہی مریض ہوں۔ بسکٹ دیکھ کر روح فنا ہو گئی مگر اس نے اتنا اصرار کیا تو ان کو بھی برداشت کرنا پڑا۔ میں چائے پیتا رہا اور برابر سوچتا رہا کہ جاڑے کی اس سرد رات میں یہ "ٹی پارٹی" کس تقریب میں کی جا رہی ہے! اسی اثنا میں کوٹھڑی کے اندر سے بچّے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہنے لگی۔

"اماں اسے دودھ پلا دیجیے۔ میں نے بوتل میں دودھ گرم کر کے بھر دیا ہے۔"

لیکن بچہ برابر روتا رہا۔ عائشہ کی ماں اُسے چمکارتی رہی۔ پھر بڑبڑانے لگی: "خواہ مخواہ کی میرے سر مصیبت ڈال دی ہے۔ کم بخت کسی طرح چپ ہی نہیں ہوتا۔"

وہ جھٹ سے بولی: "اسے ہے، اماں، اتنی سی معصوم جان کو ایسا نہ کہو۔"

وہ جل کر بولی "تو پھر لو۔ تم خود ہی سنبھالو۔ میرے بس کا روگ نہیں۔"

عائشہ نے جلدی سے کوٹھڑی میں جا کر اسے گود میں اٹھا لیا اور کندھے سے لگا کر دالان میں ٹہلنے لگی۔

میں نے چائے پی کر کہا: "اچھا اب بتائیے۔ کیا بات ہے؟"

کہنے لگی: "ابھی بتاتی ہوں۔ ذرا یہ ننھا سو جائے۔"

وہ پھر چپ چاپ ٹہلنے لگی۔ میں خاموش بیٹھا قینچی مارکہ "بڑھیا سگریٹ" پیتا رہا۔ اسی دوران میں اس کے بھائی نے آ کر کہا: "باجی رکشا نہیں ملی۔ بس اسٹینڈ پر بھی نہیں ہے۔"

وہ آہستہ سے بولی: "اچھا اب تم اپنے بستر پر جا کر لیٹ جاؤ۔" پھر مجھ سے کہنے لگی: "مجھے ایک جگہ جانا ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ چل سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔" اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

میں طرح طرح کی بدگمانیوں کے باوجود انکار نہ کر سکا۔ اس نے کوٹھڑی میں جا کر کمبل اوڑھا اور

بچہ کو اس کے اندر دبکا کر بولی: "میرے ساتھ آئیے۔" میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

باہر کہر کا دھندلکا پھیلا تھا۔ سردی اب اور بڑھ گئی تھی۔ اس وقت گیارہ کا عمل ہوگا۔ محلّے پر بالکل سناٹا چھایا تھا۔ کواڑوں کے اندر روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ مجھے خوف معلوم ہو رہا تھا طرح طرح کے وسوسے ستاتے تھے۔ پتہ نہیں وہ اس وقت کہاں جا رہی تھی۔ جب تک کواڑوں کا سلسلہ جاری رہا، وہ مجھ سے دور دور چلتی رہی۔

سڑک پر پہنچ کر وہ میرے قریب آ گئی۔ مگر کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ وہ بھی خاموش رہی اور نہ ہی میں نے بات کرنے کی کوشش کی۔

چلتے چلتے ہم دونوں گرجا گھر کی جانب جانے والی سڑک پر مڑ گئے۔ سڑک بالکل سنسان تھی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کچھ دور ہم سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے چلتے رہے۔ آخر گرجا گھر کا پھاٹک آ گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ٹھہر گئی۔ راستہ بھر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ گرجا کے پھاٹک پر پہلی بار اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا: "آئیے اندر آ جائیے۔" پھاٹک کھول کر وہ احاطہ میں داخل ہو گئی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

گرجا گھر کی عمارت تک جانے والے راستہ پر بجری بچھی تھی جو ہمارے قدموں کی رگڑ سے آواز پیدا کر رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ کہیں ذرا بھی آہٹ ہوتی تو کسی انجانے خوف سے دل زور، زور سے دھڑکنے لگتا ایسا محسوس ہوتا کہ ابھی اندھیرے سے نکل کر کوئی سامنے آ جائے گا۔

ہم دونوں سہمے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

گرجا گھر کے صدر دروازے پر پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا: "آپ یہاں درختوں تلے ٹھہر جائیے۔ میں ابھی آتی ہوں۔" میں نے غور کیا کہ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

گرجا گھر کے بڑے ہال میں دھندلی دھندلی روشنی تھی جو دریچوں کے شیشوں سے چھن چھن کر کہر کے نیلگوں دھندلکے میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ گرجا کے سب دروازے بند تھے۔ صرف ایک کھلا تھا۔ وہ بچے کو کمبل میں لپیٹے ہوئے آگے بڑھی۔ دروازے میں داخل ہوئی اور ہال کے اندر چلی گئی۔

میں دم بخود کھڑا اسی جانب تک رہا تھا۔ ایک منٹ گزرا۔ دوسرا گزرا، تیسرا گزرا میری سراسیمگی

میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک گرجا گھر کا گھنٹا رات کے پر ہول سناٹے میں زور زور سے بجنے لگا۔ میں اور خوف زدہ ہو گیا۔ چاہا کہ بھاگ کھڑا ہوں۔ عین اس وقت عائشہ دروازے سے نکل کر جھپاک سے میرے پاس آگئی۔ گھبراہٹ اور بدحواسی کے عالم میں وہ مجھ سے ٹکرا گئی۔ میں نے اسے سنبھالا۔ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔

اس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا "آئیے چلیں" اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلنے لگی۔ میں بھی اسی رفتار سے چلنے لگا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر میں نے سنا۔ گرجا گھر کے اندر کسی ننھے بچے کے رونے کی آواز گونج رہی تھی۔

جب ہم دونوں پھاٹک سے گزر کر باہر سڑک پر آگئے تو ذرا اوسان بجا ہوئے۔ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا "کیا تم نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا "ہاں!"

تھوڑی دور تک ہم پھر خاموش چلتے رہے۔ آخر جب گرجا گھر دور ہو گیا تو میں نے پھر دریافت کیا۔

"تم نے اسے وہاں کیوں چھوڑ دیا؟"

وہ آہستہ سے بولی "اس کے علاوہ اور کرتی بھی کیا؟"

مجھے اس کا جواب سن کر جھنجھلاہٹ معلوم ہوئی "اس طرح ننھے سے بچے کو چھوڑتے ہوئے تم کو کچھ دکھ نہیں ہوا؟"

وہ چلتے چلتے رک گئی۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مجھ کو سچ مچ بڑا دکھ ہے۔"

اندھیرے میں اسے دیکھ نہیں سکا۔ میرا خیال ہے کہ وہ رو رہی تھی۔ لیکن مجھے نہ تو اس پر ترس آیا اور نہ اب جھنجھلاہٹ معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے بے چین ہو کر اس سے پھر پوچھا۔

"آخر تم نے اپنے بچے کو اس طرح گرجا گھر میں کیوں ڈال دیا؟"

"میرا بچہ!" اس دفعہ اس کی آواز صاف تھی مگر لہجے میں استعجاب بھی تھا۔

"تمہارا نہیں تو پھر کس کا بچہ تھا"

"اسی لیے تو میں نے اسے وہاں چھوڑ دیا" لمحہ بھر رک کر اس نے ٹھنڈی سانس بھری "آپ

میری بات کا یقین کریں اور اگر آپ یقین نہ بھی کریں تو کیا ہوتا ہے۔ میں کس کس کو یقین دلاتی پھروں گی کہ وہ میرا بچہ نہیں تھا۔ میری ناک میں گوشت بڑھ گیا تھا۔ اس کا آپریشن کرانے کے لیے اسپتال میں داخل ہو گئی تھی۔ وہیں ایک عورت کے بچہ ہوا تھا۔ وہ بہت بیمار تھی۔ آخر بے چاری مر گئی۔"

"اس کا کوئی عزیز اقارب نہیں تھا؟" میں نے کرید کر پوچھا۔

"نہیں، کوئی نہیں تھا۔ بالکل لاوارث تھی۔ میں نے کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح بچے کو لے لیا تھا۔" اس نے بات کرتے، کرتے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری "آپ نے اسے دیکھا نہیں بڑا خوب صورت بچہ تھا۔ ہائے! اب میں اسے کیسے دیکھ سکوں گی۔ کتنی محنت سے تو اسے حاصل کیا تھا۔ اور کس طرح چوروں کی طرح جا کر گرجا گھر کے جھولے میں ڈال کر بھاگی ہوں۔ مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔"

میں چپ چاپ سنتا رہا اور وہ بڑے جذباتی انداز میں بولتی رہی "میں نے جب جھولے میں ڈالا تو اس میں پڑا ہوا وہ کیسا اچھا لگا۔ پھر میں نے گھنٹا بجانے کی رسی کو کھینچنے کے لیے پکڑا تو اللہ قسم ایک بار تو جی چاہا کہ رسی چھوڑ کر اسے اٹھا کر بھاگ آؤں۔ مگر پھر وہی مصیبت دھری تھی۔ خدا کرے یہ سب لوگ مر جائیں، جنہوں نے اسے مجھ سے جدا کرا دیا۔ مسلمان کا بچہ عیسائی بن جائے گا۔ اب ان کے دل میں ٹھنڈک پڑے گی" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس کی باتوں میں کتنی صداقت تھی۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اس وقت مجھے اس کی باتوں پر پورا پورا یقین آگیا تھا۔ راستے بھر وہ سسکیاں بھرتی ہوئی میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ میں نے اس سے پھر کچھ نہیں پوچھا۔

اس رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ یکایک دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دیکھا سامنے منیر کھڑا تھا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا "خیریت تو ہے؟"

وہ ہنسنے لگا "ہاں سب خیریت ہی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کچھ سگریٹ وگریٹ تو نہیں ہوں گی؟"

میں نے جل کر کہا "اتنی رات گئے تم اپنے گھر سے یہاں سگریٹ ہی مانگنے آئے تھے۔ کچھ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

وہ کہنے لگا "گھر سے کہاں آرہا ہوں۔ آج تو تمہارے قریب ہی ہوں۔"

میں نے پوچھا "وہ کیوں؟"

مسکرا کر بولا" کچھ ایسی ہی بات ہے۔ آج کچھ اپنا پروگرام ہے۔ پہلے سگریٹ نکالو۔ میرے پاس ختم ہوگئی ہے۔ پھر تم کو دکھاؤں گا کہ کیا فرسٹ کلاس لونڈیا ہے" وہ اوباش طبع لوگوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔

میں نے کمرے میں جا کر سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا اور لا کر اسے دے دیا۔ وہ چلتے چلتے کہنے لگا۔

"جی چاہے تو چلے آنا رات کو۔ کچھ تمہارا بھی بھلا ہو جائے گا۔ یہیں ۵۲ نمبر کوارٹر میں"

میں چونک پڑا۔ یہ تو ایوب کا کوارٹر تھا۔ میں نے اسے روک کر جھجکتے ہوئے کہا "اس میں تو ایوب رہتا ہے"

وہ کہنے لگا "ہاں وہی رہتا ہے۔ کیوں اس میں تعجب کی کون سی بات"

میں نے کہا "بھئی وہ تو بڑا بھلا آدمی ہے"

"بھلا آدمی ہے؟" وہ ہنسنے لگا "تم بھی بس یونہی رہے۔ اتنے عرصے سے یہاں رہتے ہو تم کو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ سالا کیا کام کرتا ہے۔ نوکری تو وہ صرف اس کوارٹر کے لیے کئے ہوئے ہے پیسے تو زیادہ چارج کرتا ہے مگر ہوٹل سے زیادہ محفوظ جگہ ہے"

میں نے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اس لیے کہ اگر بیوی نے یہ باتیں سن لیں تو خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہو جانے کا ڈر تھا۔

کئی دن بعد کا ذکر ہے۔ یہ ہفتے کی شام تھی۔ میں نے سوچا کہ آج سیکنڈ شو سینما دیکھوں گا۔ اسی اثنا میں نیاز صاحب کا پیغام ملا کہ میں ان سے فوراً مل لوں۔ ان کے گھر گیا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ اکٹھا ہیں۔ معلوم ہوا کہ انجمن کا کوئی ہنگامی اجلاس ہے۔ اس روز حاضرین کی تعداد معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ اس سے قبل جب صفدر خاں مجھے یہاں زبردستی کھینچ کر لایا تھا تو اس روز بہت کم لوگ تھے۔

کچھ دیر بعد اجلاس کی کارروائی شروع ہو گئی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ڈپٹی کمشنر کو ایک درخواست بھیجنے کی تجویز تھی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ عائشہ ایک آوارہ قسم کی عورت ہے جس کی موجودگی سے محلّے کے نوجوانوں کے اخلاق بگڑنے اندیشہ ہے۔ یہ شریف لوگوں کی بستی ہے۔ یہاں

سے ایسی بدچلن اور بدکردار عورت کو فوراً نکالا جائے۔

ایوب نے تقریر کرنے کے سے انداز میں دیر تک اخلاق پر باتیں کیں۔ نیکی اور گناہ پر بحث کی اور آخر میں محلّے میں عائشہ کی رہائش پر زبردست احتجاج کیا۔ اس کے بعد نیاز صاحب نے ایک ٹائپ شدہ درخواست نکالی جو پہلے ہی سے تیار رکھی تھی۔ سب سے اس پر دستخط کرنے کے لیئے کہا گیا میرا ارادہ تھا کہ میں وہاں سے کھسک جاؤں یا پھر دستخط کرنے سے انکار کر دوں۔ لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ میں دبّو اور کمزور طبیعت کا آدمی ہوں لہٰذا کچھ بھی نہ کر سکا اور چپ چاپ درخواست پر دستخط کر کے چلا آیا۔

سینما پہنچا تو معلوم ہوا کہ کھیل شروع ہو چکا تھا۔ کچھ دیر تک بازاروں میں ٹہلتا رہا اور جب واپس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ مہاجرین کی جھگیوں کی سمت سے عورتوں کے زور زور سے رونے کی آواز آ رہی تھی اور وہاں محلہ بھر جمع تھا۔ میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ سب لوگ عائشہ کے گھر کے سامنے ہجوم کی صورت میں کھڑے تھے۔ اندر اس کی بہنیں رو رہی تھیں۔ بین کر رہی تھیں۔ بھائی سسکیاں بھر رہا کہ ماں کو گھر کے اندر کھینچ کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نہ رو رہی تھی نہ چیخ رہی تھی۔ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہی تھی۔

"ذرا ان لڑکیوں کو چل کر سمجھاؤ۔ بھلا میری بچی کہیں مر سکتی ہے؟"

"ارے مراد خاں! کہیں عائشہ بھی مر سکتی ہے وہ تو جمیل کے لئے جوتا لے کر ابھی آتی ہوگی"

"آخر تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ مجھے اس طرح گھور کیوں رہے ہو؟ ابھی عائشہ کو آنے دو وہ تم سب کو ڈانٹ کر بھگا دے گی۔ میرے گھٹنوں کے درد کے لیے بازار سے انجکشن لینے گئی ہے۔ ابھی آتی ہوگی۔ بس ابھی"

وہ اسی طرح بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی اور لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے کہ بے چاری بڑھیا کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہجوم کے بیچ میں ایک کانسٹیبل کھڑا تھا جو اسپتال سے یہ اطلاع لے کر آیا تھا کہ عائشہ ایک تیز رفتار موٹر سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچتے پہنچتے ختم ہو گئی۔

اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ جس کے اندر سے عائشہ کی دیوانی ماں نے ایک ایک چیز نکال کر زمین پر بکھرا دی تھی۔ اس میں جوتے کا ایک ڈبا تھا۔ انجکشن تھے۔ کچھ کپڑا اور سلائی کا سامان

تھا۔ سب لوگ دم بخود تھے سارا محلہ تماشائیوں کی طرح وہاں اکٹھا تھا۔ مجھ سے یہ تماشا نہیں دیکھا گیا۔ بے ساختہ میری آنکھیں بھر آئیں اور میں آنسو پونچھتا ہوا۔ وہاں سے سیدھا گھر آگیا۔

خلیفہ جی

آخری آدمی جو اس کی میز پر سے اٹھ کر گیا، وہ ساتواں دلاّل تھا۔ اب رات کے دس بجنے والے تھے ایرانی ہوٹل کا ہنگامہ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ ہال کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ اٹھ کر گھروں کو جانے لگے تھے۔ میزیں رفتہ رفتہ خالی ہوتی جا رہی تھیں لیکن محکمہ اطلاعات کا اپر ڈویژن کلرک عتیق اللہ خاموش بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ اس نے چائے کی پانچویں پیالی ختم کر کے دوسرے پیکٹ کا آخری سگریٹ سلگایا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

ذرا ہی دیر بعد ایک شخص اس کی میز کے قریب آیا اور کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ عتیق اللہ نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اسی طرح فکرمند بیٹھا رہا۔ نووارد نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور جھک کر آہستہ سے کہا۔

"فرسٹ کلاس فلیٹ ہے، لیں گا؟"

اس دفعہ عتیق اللہ نے اس کی جانب گہری نظروں سے دیکھا اور گردن ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ وہ آدمی کہنے لگا "دیکھو سیٹھ، ہم کوئی لفڑا نہیں ڈالتا، جو بات ہے صاف صاف ہے۔ دو کمرے ایک بڑا ہے، ایک ذرا چھوٹا۔ وشٹ اوپن۔ پگڑی صرف دو ہزار پچاس روپیہ دلاّلی کا۔ ابھی چل کر دیکھ سکتے ہو۔ کراچی کے اندر اتنا سستا فلیٹ نہیں ملے گا سیٹھ۔" وہ خالص دلاّلوں کے لہجے میں اپنی بات کہتا رہا۔ عتیق اللہ گم صم بیٹھا، دل ہی دل میں ایک بار پھر جیب کے اندر پڑے ہوئے روپوں کو گننے لگا۔ اب تو ۲۰۰ سے بھی کم رقم رہ گئی تھی۔

اسے خاموش دیکھ کر دلاّل نے پوچھا: "بولو سیٹھ کیا کہتے ہو؟" عتیق اللہ نے جھکتے ہوئے انداز

میں جواب دیا: "نہیں بھئی، اتنی پگڑی کا فلیٹ ہم نہیں لے سکتے۔"

دلاّل نے گاہک پھنسانے کی ایک آخری کوشش کی: "آخر تم کتنے کا فلیٹ لیں گا؟"

عتیق اللہ جھنجھلا کر بولا: "تم پگڑی کی بات کرتے ہو، یہاں اس کی گنجائش نہیں، پھر بات کیسے ہو۔"

دلاّل نے مزید بات نہیں کی۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے، پھر وہ بغیر کچھ کہے سنے اُٹھا اور ایک طرف چلا گیا۔ لیکن اس کے جاتے ہی قریب کی میز پر بیٹھا ہوا ایک اور شخص اٹھ کر اس کے پاس آگیا۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

"مکان چاہیئے ہے؟"

عتیق اللہ نے اس دفعہ بھی رضامندی کا اظہار کر دیا: "ہاں چاہیئے تو ہے!"

وہ بے تکلفی سے بولا: "بہت پریشان معلوم ہوتے ہو۔"

عتیق اللہ اس کی بات صاف نظر انداز کر گیا۔ کاروبار میں وہ ہمدردی کا قائل نہ تھا۔ کہنے لگا۔

"چائے پیو گے؟" اس نے جواب دیا: "نہیں! ابھی چائے پی ہے۔"

"تو پھر سگریٹ پیو۔"

اس شخص نے انگلیوں کے درمیان سلگتی ہوئی سگریٹ سامنے کر دی۔

عتیق اللہ اس عرصے میں کاروباری ڈھنگ سے بات کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ کہنے لگا: "پگڑی کتنے ہزار ہوگی؟"

وہ بگڑ کر بولا: "اگر پگڑی کی بات کرنا ہے تو دلاّل سے بات کرو۔"

عتیق اللہ، اس کے جواب پر چونک پڑا۔ پہلی بار اس نے غور سے اجنبی کو دیکھا۔ سر پر لمبے لمبے بال۔ چہرے پر گھنی مونچھیں۔ دھاری دار میلی سی ریشمی قمیص اور خوب گھیردار لٹھے کی شلوار۔ وضع قطع سے وہ بڑا طرح دار غنڈہ معلوم ہوتا تھا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ پچیس چھبیس سے زیادہ نہ ہوگی۔

عتیق اللہ نے دریافت کیا: "کیا کرتے ہو تم؟"

وہ اسی بانکپن کے ساتھ تیوری پر بل ڈال کر بولا "تم کو مکان چاہیئے یا کچھ اور؟" عتیق اللہ بہت سٹ پٹایا۔ کہنے لگا: "اس میں بگڑنے کی کون سی بات ہے۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا۔" مگر اس آدمی کے انداز میں فرق نہ آیا۔

"تو پھر کام کی بات کرو۔"

محکمہ اطلاعات کے کلرک نے اس دفعہ ہتھیار ڈال دیئے: "اچھا یوں ہی سہی۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ مکان کیسا ہے، کہاں ہے، کس طرح ملے گا؟"

"یہ باتیں تم بعد میں بھی پوچھ سکتے ہو پہلے تم میرے ساتھ چلو۔"

عتیق اللہ کے پاس اب کوئی عذر پیش کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ چپ چاپ اٹھا۔ کاؤنٹر پر جا کر پیمنٹ کیا اور غنڈوں کی سی وضع قطع کے اُسی آدمی کے ساتھ رکشا میں سوار ہو کر چل دیا۔

مختلف سڑکوں کا چکر کاٹنے کے بعد رکشا سولجر بازار میں ایک مکان کے سامنے جا کر ٹھہرا۔ عتیق اللہ نے رکشا کا کرایہ دینا چاہا تو اس نے روک دیا اور اصرار کر کے خود ہی کرایہ بھی ادا کیا۔ آگے بڑھ کر مکان کا دروازہ کھولا اور عتیق اللہ سے کہنے لگا "اندر آجاؤ"۔ وہ خاموشی سے مکان میں داخل ہو گیا۔

مکان کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ شہر کے اس قدر بارونق علاقہ میں واقع ہونے کے باوجود یہ مکان بالکل ویران معلوم ہو رہا تھا۔ ایک لمبی سی تاریک راہداری عبور کر کے دونوں جب ایک کمرے کے سامنے پہنچے تو وہ شخص بڑبڑانے لگا: "معلوم ہوتا ہے ابھی تک کوئی نہیں آیا!" اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور ماچس جلا کر دیوار کے قریب رکھے ہوئے لیمپ کو روشن کر دیا۔ عتیق اللہ دہلیز پر پہنچ کر ٹھٹکا۔ اس ویران مکان میں آکر وہ کچھ خوف زدہ ہو گیا تھا۔

اس شخص نے اونچی آواز سے اسے مخاطب کیا۔ "یار! وہاں کیوں کھڑے ہو؟"

عتیق اللہ سہما ہوا سا کمرہ میں داخل ہو گیا۔ اس نے دیکھا، کمرہ بڑا گندہ تھا۔ فرش پر میلی سی دری بچھی تھی جس پر جا بجا سگریٹ اور بیڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ دیواروں پر جگہ جگہ پان کی گل کاریاں تھیں۔ کہیں پنسل سے فلمی گیتوں کے بول لکھے ہوئے تھے، کہیں مختلف قسم کی بھونڈی شکلیں بنی تھیں۔

عتیق اللہ خاموشی سے فرش پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس شخص نے کوئی بات نہیں کی۔ دری کا کونا پلٹ کر نیچے سے ایک رجسٹر اٹھایا۔ قمیص کی جیب میں لگا ہوا قلم نکالا اور رجسٹر کے ورق الٹ پلٹ کر ان پر کچھ لکھنے لگا۔

لیمپ کی روشنی میں بیٹھا ہوا اجنبی، جو وضع قطع سے صاف غنڈہ معلوم ہوتا تھا، اس پُراسرار

مکان کی ویرانی میں عتیق اللہ کو اور بھی زیادہ خطرناک نظر آنے لگا۔ آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ مگر کوئی نہ آیا۔ اور نہ اس شخص نے اس دوران میں اس سے کوئی بات کی۔ وہ بڑی محویت کے ساتھ رجسٹر دیکھتا رہا۔

عتیق اللہ کی بے چینی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر وہ اکتا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس شخص نے اس دفعہ گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کہاں چلے"؟

"اب تو رات بہت ہو گئی، کل آجاؤں گا۔"

عتیق اللہ نے چاہا کہ وہاں سے کھسک جائے مگر اس شخص نے جانے نہ دیا۔ تیکھی نظروں سے گھور کر دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بے تکلفی سے بولا: "یار تم بھی نہ جانے کیسے آدمی ہو۔ ذرا دیر اور ٹھہر جاؤ۔ خلیفہ جی اب آتے ہی ہوں گے۔" مجبوراً اسے بیٹھنا پڑا۔

وہ شخص عتیق اللہ سے بے نیاز ہو کر پھر رجسٹر دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ رات اب گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ باہر سڑک پر آمد و رفت کم ہو چکی تھی۔ آخر گیارہ بجے کے قریب راہداری میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ پھر کوئی زور سے کھنکارا۔ عتیق اللہ نے مڑ کر دیکھا۔ ادھیڑ عمر کا ایک شخص کمرے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ لیکن عتیق اللہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ پستہ قد، گٹھے ہوئے جسم اور گھنی مونچھوں کے ساتھ بڑا خوف ناک نظر آ رہا تھا۔

رجسٹر پر جھکے ہوئے آدمی نے اس کی طرف دیکھا اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "خلیفہ جی! اندر آجاؤ۔ یہ اپنے ہی آدمی ہیں۔"

وہ اندر آکر اطمینان سے بولا: "پہلے تو کبھی دیکھا نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ تھکا ہوا سا دیوار سے ٹیک لگا کر دری پر بیٹھ گیا۔ "آج تو ان سالوں نے اپنی ذلیل کرا دی۔"

کمرے میں کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر خلیفہ جی نے کہا: "ابے بختیار! یہ لونڈے ابھی تک کیوں نہیں آئے؟ نہ جانے سالے کہاں جا کر مر گئے۔ کسی حرام کے تخم کا پتہ نہیں۔"

بختیار نے رسان سے کہا: "آتے ہی ہوں گے خلیفہ جی۔"

اس دفعہ خلیفہ جی نے عتیق اللہ کو مخاطب کیا: "کیوں جی یہ بختیار تمہارا کوئی رشتے دار

دشتے دار لگے ہے؟" عتیق اللہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بختیار بیچ میں بول اٹھا۔

"نہیں خلیفہ جی، ان سے تو آج ہی ملاقات ہوئی ہے۔"

خلیفہ نے مشتبہ نظروں سے عتیق اللہ کو دیکھا۔ بختیار فوراً اس کی نظروں کے بدلے ہوئے انداز کو بھانپ گیا۔ کہنے لگا "خلیفہ جی یہ رہنے کو مکان چاہتے ہیں۔ بیچارے بہت پریشان تھے دلالوں کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ میں کوئی ہفتہ بھر سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی دلال ساتھ ہے۔ چائے چل رہی ہے۔ سوڈا لیمن آ رہا ہے۔ سگریٹ سلگ رہے ہیں۔ سیٹھ سیٹھ کہہ کے سالوں نے اچھے خاصے پیسے کٹوا دیئے اور کام ذرا بھی کر کے نہ دیا۔" خلیفہ جی نے بختیار کی باتیں سن کر عتیق اللہ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

"ارے میاں! تم کہاں ان دلالوں کے پھیر میں پڑ گئے۔ یہ تو سالے حجامت کر کے رکھ دیتے ہیں۔" پھر وہ بختیار کی جانب متوجہ ہوا۔ "اچھا کیا کہ ان کو یہاں لے آیا۔ اپنے پاس دو تین کمرے بیکار ہی تو پڑے ہیں۔ کسی کا بھلا ہو جائے۔ اپنا کیا جاتا ہے۔"

بختیار جھٹ سے بولا "یہی تو میں نے بھی سوچا۔ پھر ایک بار خلیفہ جی تم نے کہا بھی تھا۔"

خلیفہ نے تائید کرتے ہوئے کہا "ہاں جی یاد آیا۔ مکان کا اس طرح آجکل کے زمانہ میں خالی رہنا ٹھیک نہیں۔"

خلیفہ جی نے کرتے کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی سلگائی اور بنڈل عتیق اللہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا "میں نے آج بہت سگریٹ پی ڈالی۔ اس وقت بالکل جی نہیں چاہ رہا ہے۔" خلیفہ جی نے مزید اصرار نہیں کیا۔ بیڑی کا بنڈل اور ماچس سامنے زمین پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں ایک پیر اٹھا کر دوسرے پر رکھ لیا اور سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر شلوار کے نیفے کو ٹٹولتے ہوئے بڑبڑانے لگا "اس سالے نے تو کمر میں گھاؤ ڈال دیا۔" اس نے نیفے میں اڑسا ہوا لمبا سا چاقو نکالا اور دری کے نیچے رکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں جی تم کو مکان چاہیئے ہے؟"

عتیق اللہ پہلے ہی سہما ہوا تھا۔ چاقو دیکھ کر اور بھی خوفزدہ ہو گیا۔ جی چاہا کہ ہاتھ جوڑ کر انکار کر دے۔ نہیں بابا! میں تمہارے مکان سے باز آیا۔ مگر اب اس کا موقع نہیں تھا۔ دبی زبان سے بولا "مکان کیلئے

تو مدت سے سرگرداں ہوں۔ دلال ہزاروں کی پگڑی مانگتے ہیں۔ اپنے پاس اتنی رقم نہیں۔"

خلیفہ جی ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا "اجی ان کی ایسی کی تیسی۔ تم ابھی جا کر اپنا سامان لے آؤ اور یہ آگے کے دو کمرے لے لو۔" خلیفہ جی نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ اسی اثنا میں دو نوعمر لڑکے ہنستے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

"سلام خلیفہ جی"

"سلام خلیفہ جی"

وہ خلیفہ جی کے سامنے ادب سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ وہ بڑے رعب دار لہجے میں بولا "کیوں بے! کہاں سے آ رہے ہو۔ بڑی باچھیں کھلی ہوئی ہیں۔ کچھ کام دام بھی کیا یا یوں ہی بے فضول مستی دکھا رہے ہو۔ لاؤ۔ کیا لائے۔" دونوں نے جیبیں ٹٹولیں اور نوٹ اور ریزگاری نکال نکال کر خلیفہ جی کے سامنے ڈالنے لگے۔

وہ ان کو اٹھا کر گنتے ہوئے کہنے لگا "ابے یہ تو پورے پچیس بھی نہیں۔"

ان میں سے ایک بولا "آج تو اپنا اڈہ بالکل خالی تھا۔"

خلیفہ جی بگڑ کر بولا "سالو تم ڈیوٹی پر تھے ہی کب۔ میں ابھی چکر لگا کر آ رہا ہوں۔ للّی اور کلو دا تو دکھے تھے۔ باقی کسی حرام خور کا پتہ نہیں تھا۔ ہزار دفعہ کیا کہ بس اسٹینڈ پر دفتروں کی چھٹی کے وقت کے علاوہ ۸ سے ۹ بجے رات تک بھی کام ہوتا ہے۔ پر تمہارے تو دھیان کہیں اور ہی ہوتے ہیں۔" وہ آنکھیں نکال کر ذرا دیر تک دونوں کو ڈانٹتا رہا۔

اسی اثنا میں دروازے پر ایک لڑکا اور نمودار ہوا۔ سانولی رنگت، بدن پر صرف بنیان اور گندہ نکر، بال ایکڑوں کی طرح الجھے ہوئے، ہونٹوں پر پان کی دھڑی، وہ سگریٹ کا کش لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ مگر خلیفہ جی پر نظر پڑتے ہی اس کی سٹّی گم ہو گئی۔ سہما ہوا سا دور کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

خلیفہ جی نے ڈپٹ کر کہا "ابے منہ چھپا کر کیوں بیٹھ رہا ہے۔ سالے ادھر سامنے تو آ۔ آج بھی کوئی بہانہ بتا کرنے کا ارادہ ہے؟"

وہ کھسک کر روشنی میں آ گیا اور اس طرح بولنے لگا جیسے منمنا رہا ہو "نہیں خلیفہ جی! قسم

سلے لو جو آج کچھ کام کیا ہو۔ ایک موقع لگا تھا مگر ہاتھ خالی گیا۔ سالا خواہ مخواہ فیل مچانے لگا۔“

خلیفہ جی نے یقین نہ ملنے کے سے انداز میں کہا ”ابے تو کیا بھوریا واں نہیں تھا؟“

اتنے میں بھوریا بھی آ گیا۔ خلیفہ جی نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا: ”کیوں بے! یہ امامی ٹھیک کہہ رہا ہے؟“

وہ بگڑ کر بولا: ”خلیفہ جی یہ صفا جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ تو سالا ایکٹر ہے ایکٹر۔ جب اس نے کام کیا تو میں جھٹ اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مگر اس نے تو میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ میں نے اشارہ بھی کیا کہ رقم ادھر کھسکا دے۔ لیکن یہ تو فوراً نو دو گیارہ ہو گیا۔“

خلیفہ جی کہنے لگا: ”اور یہ تو کہہ رہا تھا کہ ہاتھ خالی گیا۔“

بھوریئے نے اس کی طرف گھور کر دیکھا: ”لو اور سنو، میں نے خود اس کے ہاتھ میں بٹوہ دیکھا تھا۔ خلیفہ جی یہ سالا اپنے اس حرامی پن سے ایک دن سب کو پھنسوائے گا۔“

خلیفہ جی کا چہرہ غصہ سے سُرخ پڑ گیا۔ غضب ناک ہو کر گرجا: ”کیوں بے حرامی! اب یہ چالیں تو ہم سے چلے گا۔ ادھر آ حرام خور تیری تو.....“ خلیفہ نے ایک موٹی سی گالی دی۔

امامی گڑگڑانے لگا: ”خلیفہ جی! یہ بے فضول الزام لگا رہا ہے۔ باپ قسم، میں نے ایک لفظ جھوٹ نہیں کہا۔“

خلیفہ جی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بختیار سے مخاطب ہوا۔ ”ابے بختیار! اس حرام کے تخم کے لگا دو ٹھڈ۔ سالا اپنے سے فلاسٹین کرنے لگا ہے۔“

بختیار نے جھپٹ کر ایک ہی ٹھڈ لگایا تھا کہ امامی چیں بول گیا: ”ارے مر گیا خلیفہ جی! ابھی بتاتا ہوں۔“ وہ فرش پر اوندھے منہ گر پڑا۔

بختیار کو دوسرا ٹھڈ لگانے کی ضرورت نہ پڑی۔ امامی سسکیاں بھر کر کہنے لگا: ”خلیفہ جی سچ کہہ رہا ہوں۔ گیارہ روپے ملے تھے۔ دس اس سالی، بانو نے رکھ لیے۔ میں نے بہت کہا، پر وہ باز نہ آئی کہنے لگی۔ جا نہیں دیتے۔ کہہ دینا خلیفہ جی سے کہ بانو نے رکھ لیئے ہیں۔ ایک روپیہ بچا تھا، اس میں سے ۱۳ آنے یہ رہے۔“ اس نے اپنی جیب سے کچھ ریزگاری نکال کر سامنے ڈال دی۔

خلیفہ جی نے خونخوار نظروں سے اُسے دیکھا: ”تو یوں کہہ کر سالے تو پھر اس نکٹی کے پاس گیا

تھا۔ ابے وہ تو تیری ماں سے بھی بڑی ہو گی۔ سالے اس کے چکر میں پڑ گیا تو کھونٹی پر لٹکانے کے قابل بنا دے گی۔ لاکھ دفعہ کہا کہ تو اس چھنال کے پاس مت جایا کر، پر تجھے تو سالے جوانی چڑھ رہی ہے جوانی۔ لگواؤں ابھی دو ٹھڈ اور۔“

امامی بھوں بھوں کر کے رونے لگا: ”مر جاؤں گا خلیفہ جی، میری توبہ، جو اب کبھی اس حرام زادی کے پاس جاؤں۔“ خلیفہ جی اس کو بری طرح گالیاں دینے لگا۔

اس عرصہ میں اور بھی جیب کترے آ گئے تھے۔ ان میں ادھیڑ عمر کے گھاگ جیب کترے بھی تھے، مضبوط پٹھوں والے نوجوان بھی تھے اور دُبلے پتلے، پھُرتیلے، کم سن لڑکے بھی تھے۔ کمرے کے اندر اب خاصی چہل پہل ہو گئی تھی۔ ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جا رہے تھے۔ جنہوں نے لمبا ہاتھ مارا تھا، وہ بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہے تھے۔ جو خالی ہاتھ لوٹے تھے، وہ جھینپے سے بیٹھے تھے۔

خلیفہ جی ہر اک سے باری باری رقم وصول کرتا جا رہا تھا۔ بختیار اسے رجسٹر میں درج کر رہا تھا۔ خلیفہ جی کسی کو شاباش دیتا۔ کسی کو گالیاں دیتا۔ کسی کو صرف سمجھا بجھا دیتا۔ عتیق اللہ کو یہ ساری باتیں بڑی تعجب خیز معلوم ہوئیں۔ کچھ تو اس لیئے کہ یہ سب کچھ اس کے لیے بالکل نیا تھا اور کچھ اس لیے کہ جو بھی آتا، اسے کسی قدر حیرت سے دیکھتا۔ اس کی نئی بش شرٹ اور ریڈی میڈ کارڈرائے کی پتلون کا جائزہ لیتا۔ پھر آپس میں اس کے متعلق کانا پھوسی ہوتی۔ اس وقت اسے سخت جھنجلاہٹ ہوتی کہ خواہ مخواہ یہ سب اسے بھی جیب کترا سمجھ رہے ہیں۔

جب ساری رقم اکٹھا ہو گئی تو خلیفہ جی نے اس میں سے ۲۵ فیصدی علیحدہ کر کے بقیہ روپے تمام جیب کتروں میں تقسیم کر دیئے۔ لیکن ان میں بھی درجے بندی اور حفظِ مراتب تھا۔

درجہ اول ۲۵ فیصدی

درجہ دوم ۱۵ فیصدی

درجہ سوم ۱۰ فیصدی

سب کو خرچ دینے کے بعد اس نے ایک لڑکے کو آواز دی: ”ابے فیاض ملاباری سے گیارہ سنگل چائے کے لیے تو جا کر کہیو اور ہاں ایک پیکٹ کیپسٹن سگریٹ کا بھی کہہ دیجیو۔“

ذرا ہی دیر بعد باہر والا چائے لے کر آگیا۔

جب چائے کے دور سے فراغت ہوگئی تو خلیفہ جی، عتیق اللہ کی طرف متوجہ ہوا: "ہاں جی تو اب تمہارا کام ہو جانا چاہیے بھئی معاف کرنا۔ ان سے نہ نبٹتا تو یہ سب جان کھا جاتے۔ چلو میں تم کو کمرے دکھا دوں۔"

اس نے اٹھ کر لیمپ ہاتھ میں لیا اور دونوں طویل راہداری سے گزر کر ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ کمرہ مکان کے باہری رخ پر تھا۔ عتیق اللہ نے دیکھا، کمرہ خاصا کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ دوسرا کمرہ بھی ویسا ہی تھا۔ دونوں کمرے پختہ بھی تھے اور ہوادار بھی۔

خلیفہ جی کہنے لگا: "کمرے تم نے دیکھ لیے۔ اب اپنا سبیتا کرلو۔ میری مانو تو ان کمروں میں تمہاری مزے سے گزر بسر ہو سکتی ہے۔"

عتیق اللہ نے جواب دیا: "خلیفہ جی، کمرے تو بہت اچھے ہیں اور میرے گزارے کے لئے کافی ہیں۔" اس نے قدرے تامل کے بعد دبی زبان سے کہا: "کرایہ اس کا کتنا ہوگا؟"

خلیفہ جی ہنسنے لگا: "اماں، تم بھی کیا بات کر رہے ہو۔ کرایہ اس کا کیا ہوگا؟"

مگر عتیق اللہ نہ مانا۔ اصرار کر کے بولا: "پھر بھی کچھ نہ کچھ تو کرایہ دینا ہی ہوگا۔"

خلیفہ جی بدستور ہنستا رہا: "اچھا جی یوں کرو کہ ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو تم چائے پانی کر دیا کرو۔ بس یہی دس پانچ روپے لگا کر۔ اس طرح پلنڈے بھی خوش ہو جائیں گے اور تم کو بھی اطمینان ہو جائے گا کہ مفت میں نہیں رہتے۔"

وہ اس بات پر رضامند ہو گیا: "خلیفہ جی جیسی آپ کی مرضی۔"

اس کے بعد خلیفہ جی نے مکان کے سلسلہ میں اپنی کچھ شرطیں بھی بتائیں۔ بڑے شفقتانہ لہجے میں بولا: "دیکھو بھائی اپنے کسی ملنے جلنے والے کو کبھی رات کے وقت یہاں نہ بلانا۔ دوسری بات یہ کہ مکان کا دروازہ کسی وقت بند نہیں رکھنا۔ تم اپنے کمروں میں تالا ڈال سکتے ہو۔ اس کے علاوہ کسی کے بہکائے سکھانے میں آکر مکان الاٹ کرانے کی کوشش نہ کرنا۔ ورنہ اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔ تم ہمارے یار ہو۔ جب تک جی چاہے رہو۔"

عتیق اللہ نے ساری شرطیں بلاحیل و حجت منظور کرلیں۔

جب ساری باتیں طے ہو گئیں تو خلیفہ جی نے مشورہ دیا: "میرا کہا مانو تو ابھی جا کر اپنا سامان لے آؤ۔" عتیق اللہ بھی یہی چاہتا تھا۔ خلیفہ جی نے فوراً اپنے دو شاگردوں کو بلایا اور عتیق اللہ کے ساتھ کر دیا۔ اسی رات وہ سامان اٹھوا کر اس مکان میں آگیا۔

اس قدر آسانی سے مکان مل جانے پر عتیق اللہ کو خوشی بھی ہوئی اور خوف بھی دامن گیر تھا۔ پولیس کا خوف، بدنامی کا خوف اور سب سے بڑا یہ خوف کہ کہیں وہ بھی ان کے ساتھ رہ کر جرائم پیشہ نہ بن جائے۔ لہٰذا شروع شروع میں تو وہ بہت پریشان رہا اور دوسرا مکان حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر نہ تو اسے کوئی اور مکان ہی مل سکا اور نہ اس کی تنخواہ میں اتنی گنجائش تھی کہ کسی ہوٹل میں رہائش اختیار کر سکے۔ لیکن پریشانی کا یہ دور زیادہ مدت تک نہ چل سکا۔ رفتہ رفتہ وہ اس ماحول سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ تمام جیب کترے اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ راہ میں کہیں مل جاتے تو بڑے تپاک سے سلام کرتے۔ چائے پینے کے لئے اصرار کرنے۔ بڑی مشکل سے وہ ان سے پیچھا چھڑاتا۔ لیکن وہ سگریٹ پلائے بغیر تو اسے جانے ہی نہ دیتے۔

خلیفہ جی کا رویہ بھی بہت دوستانہ تھا۔ وہ ہفتہ میں دو چار بار ضرور اس کے پاس آتا۔ بڑے گھریلو انداز میں باتیں کرتا۔ عام طور پر یہ ملاقاتیں شام کو ہوتی تھیں۔ مگر بڑی مختصر۔ اس لیے کہ کوئی نہ کوئی جیب کترا اس عرصہ میں آجاتا۔ اسے دیکھتے ہی خلیفہ جی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس موقعہ پر وہ ہمیشہ کہا کرتا: "اچھا عتیق بھائی، زندگی رہی تو کل پھر ملیں گے۔ اب اپنے دفتر کا ٹیم ہو گیا۔" اس دفتر والی بات پر عتیق کو بڑی ہنسی آتی۔ اس کے علاوہ خلیفہ جی کی اپنی اور بھی ایسی ہی مخصوص اصطلاحات تھیں۔ وہ اس مکان کو ہیڈ کوارٹر، اپنے رات کے وقت کو دفتر کا ٹیم، سب کے مل بیٹھنے کو میٹنگ اور جیب کتروں کو کاری گر کہا کرتا۔ خلیفہ جی کی کچھ خفیہ اصطلاحات بھی تھیں جن کو وہ خاص خاص موقعوں پر استعمال کرتا تھا۔

جب کوئی نیا جیب کترا ان کی ٹولی میں شامل ہوتا تو اس روز خاص طور پر جشن منایا جاتا۔ پانچ سیر مٹھائی، ہار پھول، سگریٹ اور چائے کا بندوبست کیا جاتا۔ اس روز سارے جیب کترے سرِ شام ہی اڈے پر لوٹ آتے اور جب سب اکٹھا ہو جاتے تو خلیفہ جی باقاعدہ وضو کرتا۔ اگربتی سلگاتا اور نیاز دے کر مٹھائی کا ایک ٹکڑا گروہ کے نووارد ممبر کو اپنے ہاتھ سے کھلاتا اور اپنے سر پر سے ٹوپی اتار کر

ذرا دیر کے لیے اسے پہنا دیتا۔ اس کے بعد نیا جیب کترا سب سے بغل گیر ہوتا۔ اسے ہار پھول پہنائے جاتے۔ شیرینی تقسیم ہوتی اور پھر ہنسی مذاق اور قہقہے شروع ہو جاتے۔

ایسی ہر تقریب میں شرکت کے لئے عتیق اللہ کو اصرار کر کے بلایا جاتا۔ لیکن عتیق اللہ کو اس روز بڑا لطف آتا جب خلیفہ جی سب کی نئے سرے سے ڈیوٹیاں مقرر کرتا تھا۔ یہ تبدیلی ہر پندرہ روز کے بعد ہوتی تھی۔ خلیفہ جی کسی کو اس سے زیادہ مدت تک ایک جگہ کبھی نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا کسی کو ریلوے اسٹیشن پر، کسی کو بنک پر، کسی کو ہوائی اڈے پر تعینات کیا جاتا۔ ان میں زیادہ تر سینئر قسم کے جیب کترے ہوتے تھے۔ نئے رنگروٹ عام طور پر بازاروں اور بس کے اڈوں پر لگائے جاتے تھے۔

خلیفہ جی جب ڈیوٹی مقرر کرتا تو اس روز گرہ کٹی کے فن پر باقاعدہ لیکچر دیتا۔ نئے نئے گر اور نت نئے ہتھکنڈے بتاتا۔ عتیق اللہ نے اندازہ لگایا کہ سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے افراد کی نفسیات خلیفہ جی بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ چنانچہ ایک روز ایسا ہوا کہ تلی نے ایک سرکاری افسر کی جیب صاف کی۔ بڑا خوش تھا کہ ہاتھ مار لیا۔ مگر بٹوے سے صرف ۲ روپے اور کچھ ریزگاری نکلی۔ خلیفہ جی کو پتہ چلا تو تلی کو خوب ڈانٹا۔ پھر پوچھنے لگا۔

"ابے یہ کام تو نے کہاں کیا تھا؟"

وہ بولا: "دفتر کے پاس جب وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا"

خلیفہ جی سر پر ہاتھ مار کر بولا: "بھئی کمال کر دیا اس بھتنی والے نے۔ بھلا یہ بھی کوئی کاریگری کا موقع تھا۔ ایسے شخص کی جیب پر ہمیشہ ہاتھ کی صفائی اس وقت دکھائی جاتی ہے، جب وہ بازار میں موٹر سے اتر کر کسی دکان میں داخل ہو رہا ہو۔ وہ بھی مہینہ کی شروع تاریخوں میں ورنہ ان کے کنے کچھ نہیں ہوتا"

اسی طرح ایک بار بھورئیے نے ایک عورت کے پرس پر ہاتھ مارا۔ ہاتھ اوچھا پڑا۔ پٹتے پٹتے بال بال بچ گیا۔ خلیفہ جی نے اس کی بھی خبر لی۔ کہنے لگا: "ابے الو کے پٹھے! میں نے ہزار بار کہا کہ عورت پر کبھی ہاتھ نہ ڈالنا۔ وہ تو سالی یوں ہی چوکس چلتی ہے۔ پاس سے گزرو تو اس کے بدن میں گدگدی دوڑ جاتی ہے۔ ایسے کے ہاتھ لگانے کی کہاں گنجائش۔ پھر سالیاں غل ایسا مچاتی ہیں کہ جان بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ خبردار جو آئندہ ایسا کیا ورنہ سالے خاں کسی روز صاف دھر لئے جاؤ گے"

خلیفہ جی صرف نام کا خلیفہ نہیں تھا۔ اپنے فن میں ماہر تو وہ تھا ہی، اس کے علاوہ اپنے تمام شاگردوں کے رگ و ریشے سے پوری طرح واقف تھا۔ ہر ایک کی فطرت اور خو بو کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ اس کی اس سوجھ بوجھ پر تو عتیق اللہ ایک بار دنگ رہ گیا۔ ہوا یہ کہ ایک روز عتیق اللہ نے گھڑی کو بہت تلاش کیا۔ جب نہ ملی تو شام کو خلیفہ جی سے تذکرہ کیا۔ وہ کہنے لگا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مل جائے گی"

عتیق اللہ چپ ہو گیا۔

خلیفہ جی جھنجھلا کر اپنے جیب کتروں کو گالیاں دینے لگا: "عتیق بھائی، میرے یاں بعض ملدے سالے بڑے حرامی ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ مہینے کی آخری تاریخیں ہیں۔ اپنے لوگوں کا حساب یہ ہے کہ آٹھ دس تاریخ تک تو کٹھر ڈھونڈنا نہیں پڑتا۔ جس کے بھی ہاتھ ڈال دیا، کچھ نہ کچھ لے ہی نکلے۔ پھر بیس بائیس تاریخ تک شکار کو بھانپنا پڑتا ہے۔ اور اس کے بعد کی نہ پوچھو۔" وہ کھلکھلا کر ہنسا "تم سے سچ کہے ریا ہوں کہ بھائی اکثر تو اپنی جیب بھی سنبھال کر چلنا پڑتی ہے"

اس کی بات سن کر عتیق اللہ کو بھی ہنسی آگئی۔

رات ہوئی اور جب سب جیب کترے اکٹھا ہوئے تو خلیفہ جی نے اونچی آواز سے کہا۔

"آج دن میں عتیق بھائی کی گھڑی کسی اپنی ماں کے یار نے پار کر دی۔ سالے نے میری ناک کٹوا دی"

اتنا کہہ کر اس نے سب کے چہروں کا بغور جائزہ لیا۔ سب چپ بیٹھے تھے۔ خلیفہ جی ایک ایک کے چہرے کو، آنکھوں کو، اس کی ہر حرکت کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے کے اندر بالکل خاموشی تھی۔ کئی منٹ اسی عالم میں گذر گئے۔ ناگاہ، خلیفہ جی نے ڈپٹ کر کہا۔

"ابے فیضو ادھر سامنے تو آ"

فیضو سہما ہوا سا اٹھ کر خلیفہ جی کے سامنے آگیا۔ خلیفہ جی نے چیخ کر کہا: "کیوں بے حرام کے تخم تیری تو!" اس نے گالی دے کر بختیار سے کہا: "پلا سالے کو کریلے کا پانی"

بختیار نے نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ کر ایک گندی سی شیشی نکالی۔ جس میں ہرا ہرا عرق بھرا ہوا تھا۔ اس نے بڑھ کر بڑی بے رحمی سے فیضو کو پچھاڑا اور اس کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ تلی نے زبردستی فیضو کا منہ کھول دیا۔ بختیار نے شیشی کھول کر کئی قطرے اس کے حلق میں ٹپکا دیئے۔

فیضو ہاتھ جوڑ کر غیں غیں کرنے لگا۔ خلیفہ جی بولا: "چھوڑ دو سالے کو" دونوں نے اسے چھوڑ دیا۔ فیضو ابکائیاں لینے لگا۔ خلیفہ جی نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"کہاں ہے گھڑی؟"

وہ جلدی سے بولا "بیس روپے میں ایک جگہ رکھی ہے۔ ابھی جا کر لاتا ہوں۔"

خلیفہ جی نے ملّی سے کہا: "ابھی جا سالے کے ساتھ۔"

ملّی فوراً فیضو کے ساتھ اٹھ کر چلا گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد عتیق اللہ کو اس کی گھڑی واپس مل گئی۔

عتیق اللہ کو اس مکان میں رہتے ہوئے اب دو مہینہ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وہ تمام جیب کتروں کی عادتوں سے اور ان کی اصطلاحات سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔ یہیں اگر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر میں جیب کتروں کے مختلف گروہ تھے جنھوں نے اپنے اپنے حلقے بانٹ رکھے تھے۔ سب میں ایک طرح کا باہمی سمجھوتہ تھا۔ کوئی کسی کے علاقے میں جا کر کام نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ ایک بار ایسا ہوا کہ خلیفہ جی دن بھر کی کمائی وصول کر رہا تھا۔ عین اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ سب گھبرا گئے۔ خلیفہ جی کے اشارے پر بختیار باہر گیا۔ سب کے چہرے فق ہو رہے تھے۔ مگر جب بختیار ایک چھریرے بدن کے نوجوان کو اندر لے کر آیا تو گھبراہٹ جاتی رہی۔ خلیفہ جی ہنس کر بولا۔

"میرے یار تو نے تو خواہ مخواہ کی کھلبلی مچا دی تھی۔ خیریت تو ہے۔ آج ادھر کیسے نکل آیا؟"

نووارد نے کہا: "استاد نے کہلوایا ہے کہ تمہارا ایک آدمی ہمارے علاقے میں کام کر گیا ہے۔ یہ بہت بری بات ہے۔"

خلیفہ جی نے تائید کرتے ہوئے کہا "ہاں جی، یہ بہت بری بات ہے۔" پھر اس نے گھور کر اپنے شاگردوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھا: "ابے تم میں سے کون گیا تھا استاد کلّن کے علاقے میں آج؟"

بھوریا منمنا کے بولا: "خلیفہ جی وہ ایسا ہوا!"

خلیفہ جی نے بات کاٹ کر ایک موٹی سی گالی دی اور پوچھنے لگا: "سالے وہ کیا تجھ سے پتلا موتتے ہیں جو تو وہاں اپنی باندگی دکھلانے گیا تھا۔ خیر اس دفعہ چھوڑے دے رہا ہوں اب

جو یہ حرکت سننے میں آئی تو سالے سمجھ لینا کہ منہ میں پیشاب کروا دوں گا۔"

وہ گڑگڑانے لگا: "نہیں خلیفہ جی، اب کے جو ایسا کروں تو جو تمہارا جی چاہے کرنا۔"

خلیفہ جی نے پوچھا: "کتنی رقم لایا تھا؟"

وہ بولا: "۳۲۸ روپے تھے۔" خلیفہ نے نووارد سے پوچھا: "کیوں جی یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

وہ کہنے لگا: "ہاں خلیفہ جی، اتنی ہی رقم ہو گی۔"

خلیفہ نے فوراً بختیار سے کہا: "نکالو جی روپے اور ان کا حساب بیباق کر دو۔"

بختیار نے ۳۲۸ روپے نکال کر استاد کلّن کے آدمی کو دے دیے۔ اس نے روپے لے کر گنے اور ۸۲ روپے خلیفہ کی جانب بڑھا کر بولا: "خلیفہ جی یہ لو اپنا کمیشن ۲۵ فیصدی سے اتنے ہی بنتے ہیں۔ تم اپنا حساب لگا لو۔"

خلیفہ جی نے کہا: "بختیار کو دے دو۔"

جب وہ جانے لگا تو خلیفہ جی نے روک کر کہا: "دیکھو جی استاد کلّن سے میرا سلام کہنا۔ ان کو سمجھا دینا کہ یہ لمڈے بڑے حرامی ہیں۔ آئندہ جو بھی ایسی بگاڑ کی صورت پیدا کرے گا، سالے کی کس کے گندی کروں گا۔ کھال میں بھُس بھروا دوں گا۔ کہنا کبھی کبھار ادھر بھی نکل آیا کرو۔ بہت دن سے دیکھا نہیں۔ موقع ملا تو میں خود آؤں گا۔"

وہ سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ عتیق اللہ ایک نئی الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ جب پچھلا مکان خالی ہونے والا تھا تو اس نے اپنے بال بچوں کو بڑے بھائی کے پاس کوئٹہ بھیج دیا تھا۔ لیکن کچھ عرصے سے بیوی نے واپس آنے کا سخت تقاضا شروع کر دیا تھا۔ ہر خط میں یہی لکھا ہوتا کہ وہ آنے کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ جٹھانی سے اس کی بالکل نہیں بن رہی تھی۔ آئے دن تُو تُو میں میں ہوتی۔ آخر اس نے ایک روز ہمت کر کے یہ مسئلہ خلیفہ جی کے سامنے رکھ دیا۔

وہ ہنس کر بے نیازی سے بولا: "عتیق بھائی تم نے بھی کمال کر دیا۔ اب تک مجھ سے بتایا بھی نہیں کہ بال بچے وہاں پڑے ہیں۔ نہیں جی، ان کو تکلیف نہیں ہونا چاہیئے۔ آج ہی تار دے کر بلا لو۔ میں اپنا دفتر سب سے پیچھے والے کمرے میں لے جاؤں گا۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔"

لیکن عتیق اللہ اس کے اس قدر اطمینان دلانے پر بھی مطمئن نہ ہو سکا۔ جھجکتے ہوئے اس نے خلیفہ جی سے دل کی بات کہہ ہی دی: "مگر اس دھما چوکڑی میں عورتوں کا رہنا مناسب نہ رہے گا۔"

خلیفہ جی نے بڑے پیار سے ڈانٹ کر کہا: "یار! تم بھی کیسی بات کرتے ہو۔ عتیق بھائی! کیا مجال جو کسی نے ادھر آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا۔ سالوں کی پیسے پر رکھ کر بوٹیاں نہ کر دوں گا۔" وہ اس وقت بہت جوش میں آگیا تھا۔ اسی لہجے میں بولا: "بس جی تم سے کہہ دیا۔ بھابی اور بچوں کو اب کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیئے۔ یار یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ وہ اس طرح پریشانی اٹھائیں۔ رہی ان لمڈوں کی بات تو تم ان کی طرف سے بالکل اطمینان رکھو۔ بدمعاشی کرنے کے لیے بازار میں کچھ کمی ہے جو کوئی سالا گھر پر ہی ڈاکہ ڈالنے کی نیت کرے گا۔"

مگر خلیفہ جی جس قدر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا عتیق اللہ اسی قدر غیر مطمئن ہوتا گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ لوگ ٹھہرے جرائم پیشہ۔ ان کے قول و فعل کا کیا اعتبار۔ نہ جانے کس وقت کیا حرکت کر بیٹھیں۔ میں ان سے لڑ جھگڑ بھی نہیں سکتا۔ سالے مجھی کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ پھر بیوی آکر یہ رنگ ڈھنگ دیکھے گی تو کیا کہے گی۔ واہ اچھی جگہ گھر لیا ہے۔ چور اچکوں میں لا کر ڈال دیا۔ عتیق اللہ کی پریشانی بڑھتی ہی گئی۔

خلیفہ جی نے اسی شام کو دونوں کمرے خالی کر دیئے۔ اپنا سامان اٹھا کر سب سے پیچھے کے کمرے میں لے گیا۔ بختیار کو ہدایت کر دی کہ سامنے کے دروازے سے آمدورفت بند کر دی جائے اور پیچھے گلی میں جو چھوٹا دروازہ کھلتا ہے، آئندہ سب لوگ اسی طرف سے آیا جایا کریں۔

اس واقعہ کے تین چار روز بعد ہی بیوی کا ایک اور خط آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ وہ عنقریب کراچی پہنچ رہی ہے۔ عتیق اللہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ یہ بات بھی خلیفہ جی سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے سنا تو خوشی کا اظہار کیا۔ اسی وقت شاگردوں کو بلا کر کہا کہ کمرے کو اچھی طرح صاف کر دیا جائے۔

مگر خلیفہ جی جس قدر سرگرمی کا اظہار کر رہا تھا، عتیق اللہ اسی قدر مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ خلیفہ جی اس کے بیوی بچوں کی آمد میں اتنی کیوں دلچسپی لے رہا ہے۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ اس سالے خلیفہ جی کا کیا ہے۔ نہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ پتہ نہیں کیا حرامزدگی کر بیٹھے۔ سوچتے سوچتے آخر عتیق اللہ کے ذہن میں ایک

ترکیب آئی۔

دن گزرا۔ رات ہوئی۔ نو بجے کے قریب، وہ تھانے پر پہنچا۔ انچارج تھانہ سے ملاقات کی۔ خلیفہ جی کے خفیہ اڈے اور اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کی روداد سنائی۔ پولیس انسپکٹر نے پوری توجہ سے ایک، ایک تفصیل سنی۔ خوش ہو کر بولا۔

"مسٹر عتیق اللہ! میں آپ کا بڑا ممنون ہوں۔ اگر لوگ اسی طرح تعاون کریں تو پولیس جرائم کا یوں چٹکی بجاتے قلع قمع کر سکتی ہے۔"

عتیق اللہ کی موجودگی ہی میں اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور ہدایت کی: "دیکھو دیوان جی، دس بارہ جوان فوراً اکٹھا کرو۔ سولجر بازار کے ایک مکان پر چھاپہ مارنا ہے۔ میں خود چلوں گا۔" ہیڈ کانسٹیبل نے حکم کی تعمیل میں دونوں پیروں کی ایڑیاں جوڑ کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

انسپکٹر اس کے جانے کے بعد عتیق اللہ کی طرف متوجہ ہوا: "میں آج ہی سب کو پکڑ کر بند کیے دیتا ہوں۔ حرام زادوں نے شہر میں اودھم مچا رکھا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ شہر میں گرہ کٹی کی دس بیس وارداتیں نہ ہوتی ہوں۔"

وہ دیر تک جیب کتروں کو برا بھلا کہتا رہا۔ اس نے عتیق اللہ کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ عتیق اللہ اٹھا اور تھانے سے باہر چلا گیا۔

گھر واپس جانا ابھی مناسب نہ تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں خلیفہ جی کو اس پر شبہ نہ ہو جائے۔ وہ جرائم پیشہ آدمی تھا۔ ایسے خطرناک شخص سے عتیق اللہ دشمنی مول لینا نہ چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا۔

گیارہ بجے رات کو جب وہ اپنے دوست کے گھر سے نکلا تو بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ لیکن جب وہ خلیفہ جی کے اڈے پر پہنچا تو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ حسب معمول سارے جیب کترے وہاں موجود تھے البتہ خلیفہ جی غصے سے منہ پھلائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی تیوری پر بل ڈال کر روکھے پن سے بولا۔

"تم آگئے جی؟"

عتیق اللہ نے مسکرانے کی کوشش کی "وہاں خلیفہ جی، کوئٹہ ابھی تار دے کر آیا ہوں۔ شاید پرسوں تک سب لوگ آجائیں گے۔" خلیفہ نے ایک لمبی ہوں کی اور اس کی بات نظر انداز کر کے بختیار سے بولا۔

"ابھی تک گدھا گاڑی نہیں آئی۔ سب سالے نمک حرام ہو گئے ہیں۔ ان کی تو۔" خلیفہ جی نے ایک سانس میں کئی موٹی موٹی گالیاں بک ڈالیں۔

بختیار جھٹ سے بولا "خلیفہ جی! میں نے علیا کو بھیجا ہے۔ وہ گدھا گاڑی لے کر آتا ہوگا۔"

خلیفہ جی نے عتیق اللہ کی طرف دیکھے بغیر بختیار سے کہا "دیکھو جی، گدھا گاڑی آتے ہی سامان لدنا شروع ہو جائے۔" عتیق اللہ نے سوچا کہ شاید خلیفہ جی اپنا سامان لدوا کر کہیں اور جا رہا ہے۔ لہٰذا اس نے دبی زبان سے پوچھا۔

"خلیفہ جی۔ کس کا سامان لدوا رہے ہو؟"

وہ کڑک کر بولا "تمہارا اور نہیں تو کیا میرا سامان جا رہا ہے، باندھو اپنا بستر بوریا بہت دن ہو چکی یاری۔"

عتیق اللہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "اس وقت رات کو میں کہاں جاؤں گا؟"

"جہنم میں۔" خلیفہ جی غضب ناک ہو کر بولا۔

اس کے غصے کا پارا برابر چڑھتا جا رہا تھا۔ عتیق اللہ نے سوچا یہ تو بہت برا ہوا۔ یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ اس نے بگڑی بات سنبھالنے کی کوشش کی "مگر خلیفہ جی، تم اچانک اس قدر ناراض کیوں ہو گئے۔ آخر ہوا کیا؟" خلیفہ جی اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ گھنی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ اسی عالم میں بولا۔

"ابے تو سمجھتا ہے کہ میں کچی گولیاں کھیلے ہوئے ہوں۔ تیرے ایسے نہ جانے کتنے ٹانگ تلے سے نکال دیئے۔ تو مجھ سے داؤں کرنے چلا تھا۔"

عتیق اللہ نے حواس باختہ ہو کر کہا "مگر خلیفہ جی۔!"

خلیفہ جی نے آگے بولنے کا اسے موقع ہی نہ دیا۔ غضب ناک ہو کر زور سے چیخا۔ "مگر وگر کی ایسی کی تیسی۔ اب تو میری آنکھوں کے سامنے سے دفان ہو جا۔ ورنہ بختیار سے دو

ٹھڈ لگواؤں گا تو سالے خاں ہسپتال میں نظر آؤ گے۔ سوچا تھا کہ چلو بھئی شریف آدمی ہے، پڑا رہے گا۔ سالا اپنا کیا لیتا ہے۔ مگر تیرے تو نطفے میں فرق ہے۔ میرے خلاف مخبری کرنے تھانے گیا تھا۔ بگاڑ لیا ہوتا میرا کچھ۔ شیخ سعدی نے سچ کہا ہے۔ اصل سے دغا نہیں۔ کم اصل سے وفا نہیں۔" وہ دیر تک اسی طرح بڑبڑاتا رہا۔ عتیق اللہ سر جھکائے کھڑا رہا کہ شاید خلیفہ جی کو اس کی حالت پر رحم آجائے۔

اسی اثنا میں گدھا گاڑی آگئی اور سامان لدنا شروع ہو گیا۔ عتیق اللہ نے ایک بار پھر خلیفہ جی کو منانے کی کوشش کی۔ عاجزی سے بولا "خلیفہ جی ذرا باہر آ کر میری ایک بات تو سن لو۔" خلیفہ جی آنکھیں نیچے کیئے ہوئے خاموش لیٹا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر خون خوار نظروں سے عتیق اللہ کی جانب دیکھا۔

"ابے جا رہا ہے یا پلواؤں کریلے کا پانی۔ سالا خامخا پخ پخ کیئے جا رہا ہے۔"

عتیق اللہ کی روح فنا ہو گئی۔ وہ گھبرا کر فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔

چاند کا داغ

حویلی میں اچانک کھلبلی پڑ گئی۔ سارے ملازم سراسیمگی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ چپّہ چپّہ چھان مارا۔ مگر نوری کا کوئی سراغ نہ ملا۔ علی مردان شاہ زخمی شیر کی طرح بپھرا ہوا خواب گاہ کے دروازہ پر کھڑا چیخ رہا تھا۔

"کہاں گئی حرام زادی۔ اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔"

لیکن "حرام زادی" اپنی چمڑی سمیت ایسی رفوچکر ہوئی کہ مردان شاہ صرف ابابیل کے پر کی سی گھنی مونچھیں پھڑپھڑاتا رہ گیا۔ بڑی تفتیش کے بعد اتنا معلوم ہو سکا کہ نوری شام ہی سے غائب ہے۔ اس کے ساتھ ہی اصطبل کے سئیے سائیس اللہ اچھایا کا بھی کہیں پتہ نہیں تھا۔

اللہ اچھایا تھا تو سائیس، مگر بہت منجھا ہوا شکاری بھی تھا۔ نشانہ بھی اس کا اچھا تھا۔ جب سے ملازم ہوا تھا ہمیشہ شکار میں علی مردان شاہ کے ساتھ رہتا تھا۔ علی مردان شاہ اس پر مہربان بھی بہت تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شکار کھیلتے ہوئے جنگلی جھاڑیوں کی اوٹ سے ناگاہ ایک بپھرا ہوا سور نکلا۔ علی مردان شاہ عین اس کے سامنے تھا۔ دلدلی علاقہ تھا۔ گھبراہٹ میں مردان شاہ کا پیر اس طور رپٹا کہ وہ لڑکھڑا کر دھڑام سے گرا۔ بندوق ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔ علی مردان شاہ جلدی سے اٹھا، مگر جنگلی سور بالکل قریب پہنچ چکا تھا، اللہ اچھایا چھپاک سے آگے بڑھا اور حملہ کرنے سے پہلے ہی اچھل کر سور کی پشت پر سوار ہو گیا۔ ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو سے سور کے پیٹ کو اس طرح چیر ڈالا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس بے جگری اور جانثاری پر مردان شاہ اس قدر خوش ہوا کہ اپنی ڈبل بیرل بندوق اللہ اچھایا کو انعام کے طور پر بخش دی۔

مردان شاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ نوری کو اللہ اچھایا اغوا کر کے لے گیا تو وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ سب دم بخود تھے ہراساں اور پریشان تھے۔ صرف مردان شاہ کی گرج دار آواز رات کے سناٹے میں گونج رہی تھی۔ اس کی دونوں بیویوں نے اپنے اپنے کمروں کے دروازے اندر سے بند کر لیے تھے اور ڈری سہمی ہوئی گم صم بیٹھی تھیں۔

مردان شاہ کے نوکروں چاکروں نے بستی کے ایک ایک گھر کی تلاشی لے ڈالی۔ جن لوگوں سے اللہ اچھایا کا میل جول تھا، انھیں ڈرایا دھمکایا گیا۔ ان پر جوتے لگائے گئے۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر الٹا لٹکایا گیا۔ مگر سب بے سود، نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ اللہ اچھایا کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ پوچھ گچھ کرنے پر ایک ہاری کی زبانی صرف اتنا معلوم ہوا کہ گوٹھ کے باہر درختوں تلے اسے اللہ اچھایا نظر آیا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی۔ جس کا چہرہ اجرک سے چھپا ہوا تھا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ اس لیے وہ اسے پہچان نہ سکا۔ دونوں تیز تیز قدموں سے سڑک کی جانب جا رہے تھے۔

یہ اطلاع فوراً علی مردان شاہ کو پہنچائی گئی۔ اس نے اسی وقت اپنے کمدار، محمد عرس ملکانی کو طلب کیا اور یہ حکم صادر کیا کہ جس طرح بنے دونوں کو لے کر آئے۔

محمد عرس ملکانی نے حکم ملتے ہی فوراً جیپ نکلوائی چار قوی ہیکل اور ہوشیار کارندوں کو منتخب کیا اور ان کے ہمراہ جیپ پر سوار ہو گیا۔ سب کے پاس مختلف قسم کا اسلحہ تھا اور وہ شکاریوں کی طرح مستعد اور چوکس نظر آ رہے تھے۔ ملکانی خود جیپ چلا رہا تھا اور اس کے زانو پر بھری ہوئی رائفل رکھی تھی۔

جیپ میں مسلح کارندوں کے علاوہ ایک کھوجی بیٹھا تھا۔ اس کا نام بخشل تھا وہ پیروں کے نشانات سے مویشیوں اور انسانوں کا سراغ لگانے کا ماہر تھا۔

محمد عرس ملکانی نے جیپ اسٹارٹ کی اور وہ ہچکولے کھاتی، گرد کے بادل اڑاتی، کچے راستے پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ علی مردان شاہ خاموش کھڑا جیپ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ علی مردان شاہ دیر تک اس سمت دیکھتا رہا جدھر جیپ گئی تھی، پھر وہ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا، اپنے کمرے میں گیا۔ کچھ دیر بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ آخر نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

حویلی پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ کوئی سویا نہیں تھا۔ سب سہمے ہوئے تھے اور جاگ رہے تھے۔ ان کو جیپ کے واپس آنے کا انتظار تھا۔

☆

رات آدھی ہو چکی تھی۔ جیپ پختہ سڑک سے نشیب میں اتر کر ویران اور ریتیلے میدان میں پہنچ گئی تھی۔ ریت کے ذرے جگ مگ، جگ مگ کر رہے تھے۔ چاندنی میں جیپ کا بے ڈول سایہ اونچے نیچے ٹیلوں پر لہرا رہا تھا۔

کھوجی بخشل اگلی نشست پر کمدار محمد عرس ملکانی کے برابر بیٹھا تھا وہ چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ بخشل قدموں کے نشان دیکھ دیکھ کر ملکانی کو ہدایات دے رہا تھا۔ وُہ بار بار جیپ رکواتا۔ نیچے اترتا۔ ریت پر بکھرے ہوئے نشانات کو غور سے دیکھتا۔ جھک کر ریت اٹھاتا۔ اسے سونگھتا، سر جھکا کر کچھ دیر سوچتا رہتا۔ پھر جیپ اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کرتا۔ کبھی اسے دائیں طرف لے جاتا۔ کبھی بائیں طرف۔ کبھی آگے لے جاتا کبھی اچانک پیچھے پلٹنے کی ہدایت دیتا۔ محمد عرس ملکانی بلا عُذر اس کی ہدایت کے مطابق جیپ دوڑاتا رہا۔

انھوں نے دس بارہ میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ دُور دُور تک کہیں آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد، لق و دق صحرا میں صرف ریت کے ٹیلے سر اٹھائے خاموش کھڑے تھے۔ ہوا میں خنکی تھی اور ہلکی ہلکی تھرتھراہٹ!

رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ بخشل کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ پرانا اور منجھا ہوا کھوجی تھا۔ دُور دُور تک اس کا شہرہ تھا مگر اللہ ابھایا اور نوری کا وہ ابھی تک کھوج نہیں لگا سکا تھا۔ اس سے بھی زیادہ پریشان اور ہراساں کمدار ملکانی تھا۔ اسے دھڑکا تھا کہ اگر وہ ناکام واپس گیا تو علی مردان شاہ کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے گا۔ نہ جانے کیا عتاب نازل ہو۔

چلتے چلتے ایک مقام پر بخشل نے جیپ رکوائی۔ فوراً نیچے اترا۔ آگے بڑھا اور کچھ دور جا کر ٹھہر گیا۔ سامنے ریت پر قدموں کے نشانات اجلی چاندنی میں صاف نظر آ رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی بخشل کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ واپس جا کر اپنی نشست پر بیٹھا اور جس سمت قدموں

کے نشانات گئے تھے ادھر جیپ بڑھانے کا اشارہ کیا۔ محمد عرس ملکانی نے اس کی ہدایت پر فوراً عمل کیا۔

قدموں کے نشانات ریت پر ایک جگہ جا کر ختم ہو گئے تھے۔ آگے ریت کا اونچا ٹیلہ تھا۔ جیپ کو اس پر چڑھایا گیا تو ڈگمگا کر لڑھکتے لڑھکتے بچی لیکن نرم نرم اوس سے بھیگی ہوئی ریت میں دھنس گئی۔ اسی وقت ریگ زار کے سناٹے میں بندوق چلنے کی خوف ناک آواز ابھری اور گولی سنسناتی ہوئی جیپ کے پاس سے گزر گئی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ دوسری گولی جیپ کے بونٹ پر لگی۔ زور کا دھماکا ہوا اور سب حواس باختہ ہو گئے۔

وہ جلدی جلدی کود کر جیپ کی آڑ میں، ریت پر لیٹ گئے۔ جن کے پاس بندوقیں تھیں انھوں نے گھات لگا کر اس ٹیلے کی سمت فائرنگ شروع کر دی جدھر سے گولی چلائی گئی تھی۔ ذرا دیر بعد جوابی فائرنگ شروع ہو گئی۔ نصف گھنٹے تک دونوں طرف سے گولی چلتی رہی۔ مگر محمد عرس ملکانی اس صورت حال سے جلد ہی پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا اس طرح تو جیپ ٹوٹ پھوٹ کر ناکارہ ہو جائے گی۔ اس لیے کہ دوسری طرف کی تمام گولیاں اسی پر آ آ کر لگ رہی تھیں۔

وہ ریت پر گھسٹتا ہوا آہستہ آہستہ ٹیلے کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح خاموشی سے ٹیلے کے عقب میں پہنچ جائے اور اچانک حملہ کر دے۔ ملکانی کچھ دُور آگے گیا تھا کہ ایک گولی اس کے سر پر سے چیختی ہوئی گزر گئی۔ وہ بال بال بچ گیا ورنہ بھیجا نکل کر باہر آ جاتا۔ ملکانی جہاں تھا وہیں دبک گیا۔ وہ دم سادھے اسی عالم میں ریت پر پڑا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے سر ابھارا اور چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ٹیلے کے نشیب میں اُسے ایک سایہ لرزتا ہوا نظر آیا۔ اس نے اپنی رائفل اٹھائی۔ نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ گولی کی آواز کے ساتھ ہی کوئی زور سے چیخا اور دوسری طرف سے فائرنگ بند ہو گئی۔

کمدار محمد عرس ملکانی جھکا جھکا آگے بڑھا اور ٹیلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا اللہ ابھایا ریت پر پڑا تھا۔ وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ گولی اس کی کنپٹی پر لگی تھی۔ چمکتی ہوئی ریت پر لاش کے قریب خون کا بڑا سا دھبہ بن گیا تھا۔ نوری خوف سے کانپ رہی تھی۔ ملکانی کو شبہ تھا کہ کئی آدمی ہوں گے۔ لیکن وہاں صرف وہی دونوں تھے۔ اللہ ابھایا کا ہاتھ ابھی تک بندوق کی لبلبی پر تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی بے جان آنکھیں نوری کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

ملکانی نے حقارت سے اللہ ابھایا کے منہ پر زور سے لات ماری۔ نوری کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتا ہوا جیپ کی طرف چل دیا۔ اللہ ابھایا کی لاش وہیں ریت پر پڑی رہی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔

✡

تاروں کی چھاؤں میں جیپ بستی میں داخل ہوئی۔ ملکانی نے جیپ حویلی کے سامنے کھڑی ہی کی تھی کہ علی مردان شاہ کی آنکھ کھل گئی۔

حویلی کے پھاٹک پر مردان شاہ کا خوف ناک چہرہ نظر آیا۔ اس نے گرج کر پوچھا "لے آئے حرام زادی کو!"

ملکانی نے "حرام زادی" کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتی ہوئی جیپ سے نکلی اور علی مردان شاہ کے سامنے جاکر دھڑام سے گری۔ مردان شاہ نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ مڑا اور کڑک کر ملکانی سے ڈپٹ کر دریافت کیا۔

"اور وہ کہاں ہے نمک حرام؟"

محمد عرس ملکانی نے جھکی ہوئی گردن فخر سے اونچی کی اور نہایت مستعدی سے اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ مردان شاہ نے پوری روداد سنی اور نوری کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اسے کوٹ کے تہہ خانے میں لے جاؤ اور ابھایا کی لاش ٹھکانے لگا دو"

فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ نوری کو کوٹ کے تہہ خانے میں پہنچا دیا گیا اور اللہ ابھایا کی لاش قبر کھود کر راتوں رات دفن کر دی گئی۔

کچھ دیر بعد علی مردان شاہ تہہ خانے میں پہنچا۔ تہہ خانے میں اندھیرا تھا۔ سیلن تھی اور ایک طاق میں کانسی کا بوسیدہ چراغ روشن تھا۔ اس کی دھندلی دھندلی روشنی میں نوری مادر زاد برہنہ کھڑی تھی۔ اس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ دو کارندے اس کے بازو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ نیم تاریک تہہ خانے میں نوری کا ویران چہرہ بالکل سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ وہ بت کی مانند ساکت کھڑی تھی۔ سیلی ہوئی دیواروں سے تیز بو اٹھ رہی تھی۔ مردان شاہ دروازے پر ٹھہر کر لمحہ بھر تک نوری کے اجڑے ہوئے زرد زرد چہرے کو دیکھتا رہا۔ نوری نے ایک بار نظر اٹھا کر علی مردان شاہ کی جانب دیکھا

اور پھر سر جھکا لیا۔ نوری کے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں خوف زدہ اور بجھی بجھی نظر آ رہی تھیں۔

مردان شاہ نے پوچھا "سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں سائیں! سب ٹھیک ٹھاک ہے!" ملکانی نے مستعدی سے جواب دیا۔

مردان شاہ نے نوری کے قریب جاکر ہاتھ بڑھایا اور اونچی آواز سے کہا "لاؤ"۔

فوراً ہی ایک کارندہ زنبور سنبھالے ہوئے اندر داخل ہوا۔ زنبور میں روپے کے برابر لوہے کا ایک دہکتا ہوا گول گول ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ علی مردان شاہ نے زنبور اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ زنبور کا دستہ لکڑی کا تھا۔ مردان شاہ نے دستے کو مضبوطی سے انگلیوں میں دبایا۔ لوہے کے سرخ سرخ گول ٹکڑے کو دیکھا۔ اس کے چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ آنکھیں ابل کر ڈراؤنی نظر آنے لگیں۔ سانس کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے نوری کے بالوں کو پکڑا اور زور سے اس طرح جھٹکا دیا کہ اس کا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ زخمی پرندے کی طرح دونوں کارندوں کی گرفت میں پھڑپھڑانے لگی۔ مردان شاہ نے لوہے کا دہکتا ہوا سرخ سرخ ٹکڑا نوری کے رخسار پر زور سے جما دیا۔

نوری تڑپ کر دردناک آواز میں چیخی۔

مردان شاہ نے ہاتھ ہٹایا تو نوری کے داہنے گال پر روپے کے برابر گول سیاہ نشان ابھر آیا تھا۔ وہ چیختے چیختے نڈھال ہو گئی تھی۔

مردان شاہ نے زنبور کارندے کو واپس دے دیا۔ لیکن ذرا دیر بعد زنبور پھر اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس میں دبا ہوا لوہے کا گول ٹکڑا انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔ نوری اسے دیکھتے ہی چیخنے لگی۔

اس دفعہ مردان شاہ نے نوری کو اس طرح داغا کہ لوہے کا دہکتا ہوا سرخ سرخ ٹکڑا اس کے نرم نرم اجلے سینے کے بیچوں بیچ جم گیا۔ چرچراہٹ کی ہلکی سی آواز ابھری اور کھال جلنے کی بو نیم تاریک تہہ خانے میں پھیل گئی۔ نوری تکلیف سے بے قرار ہو کر دیوانوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ چہرہ ڈراؤنا ہو گیا اور گال کے ساتھ ساتھ سینے پر بھی سیاہ نشان ابھر آیا تھا۔

نوری کو چھوڑ دیا گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ یہ تیرھویں لڑکی تھی جس کے جسم کو مردان شاہ نے دہکتے لوہے سے داغا تھا۔

دن نکلنے سے پہلے ہی نوری کو نکال دیا گیا۔ ایسی داغی لڑکی نہ اب حویلی میں رہ سکتی ہے نہ گوٹھ میں اُسے کوئی پناہ نہیں دے سکتا ہے۔ سب علی مردان شاہ کے عتاب سے ڈرتے ہیں۔ نہ وہ احتجاج کر سکتی ہے اور نہ تھانے میں جا کر فریاد کر سکتی ہے۔ تھانیدار کا مردان شاہ سے یارانہ ہے۔ وہ اس کے ساتھ شراب پیتا ہے۔ شکار کھیلتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر دونوں ایک دوسرے کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں۔

☆

نوری کے جاتے ہی حسب معمول مردان شاہ کے لئے نئی داشتہ کی تلاش شروع کر دی گئی۔ علی مردان شاہ کے پرانے منشی نور محمد گھانگھرو کے مشورے سے محمد عرس ملکانی نے میرل ماری کو بلایا۔ وہ علاقے کا مشہور پاتھاریدار تھا اور پرانا ہسٹری شیٹر تھا۔ وُہ چوری اور ڈاکہ زنی کرتا تھا بوتیشیوں کے ساتھ ساتھ ہاریوں کی نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کو اٹھواتا تھا اور چوری کے مال کی خرید و فروخت کرتا تھا۔ اسے بڑے زمینداروں اور وڈیروں کے علاوہ پولیس کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔

رات کا ایک پہر گزرا تو میرل ماڑی آیا۔ وہ اپنے ہمراہ ایک لڑکی بھی لایا تھا۔ وہ اس کے پانچ ہزار مانگتا تھا۔ مردان شاہ کو لڑکی پسند نہ آئی۔ اسے لڑکی کے شانے کچھ سکڑے سکڑے معلوم ہو رہے تھے۔ یوں ناک نقشہ اس کا اچھا تھا۔ صندلی رنگ تھا اور آنکھیں ستاروں کی مانند جھل مل جھل مل کرتی تھیں۔

گھنٹہ، سوا گھنٹہ بعد دوسری لڑکی لائی گئی۔ میرل نے اس کے چار ہزار روپے طلب کئے۔ وہ بھی مسترد کر دی گئی۔ اس کی گردن ضرورت سے زیادہ لمبی تھی۔

کئی لڑکیاں دیکھنے کے بعد مردان شاہ کو جو پسند آئی اس کا سودا دس ہزار میں ہوا۔ میرل کو اسی وقت پوری قیمت بھی ادا کر دی گئی۔

یہ لڑکی بہت شرمیلی اور کم گو تھی۔ حویلی کے ملازموں سے اس نے زیادہ میل جول نہ بڑھایا۔ مردان شاہ کی دونوں بیویاں خواہ مخواہ اس سے لڑائی جھگڑا کرتیں۔ گالیاں دیتیں۔ مارنے پیٹنے سے بھی دریغ

نہ کرتیں۔ مگر اس نے نہ کبھی احتجاج کیا اور نہ علی مردان شاہ سے ان کی شکایت کی۔ ہر نئی لڑکی کی آمد پر حویلی میں جو ہنگامہ برپا ہوتا تھا، اس دفعہ نہ ہوا۔

اس کا دو بل تھا۔ مگر مردان شاہ پیار سے بلی کہا کرتا تھا۔ مگر اس میں بلی جیسی کوئی خاصیت نہیں تھی۔ بلی سے زیادہ وہ کبوتری معلوم ہوتی تھی۔ ہر وقت سہمی سہمی، شرمائی شرمائی سی رہتی۔ نہ اس نے کبھی یہ بتایا کہ وہ کہاں سے آئی ہے نہ اپنے گھر بار کا کوئی پتہ نشان دیا۔ حویلی کی خادماؤں نے بہت کریدا مگر وہ ہر بار خاموش ہو جاتی۔

حویلی میں رہتے ہوئے اسے چھ مہینے سے اوپر ہو گئے لیکن اس عرصے میں نہ تو اس کے بارے میں کوئی اسکینڈل مشہور ہوا اور نہ ہی اس نے مردان شاہ کو کبھی شکایت کا موقعہ دیا۔ وہ ایک سدھے ہوئے جانور کی طرح اس کے اشاروں پر چلتی تھی۔ لیکن مردان شاہ نہ معلوم کیوں بات بات پر اس سے ناراض ہو جاتا، گالیاں دیتا، مارتا مگر اس نے کبھی بغاوت نہ کی۔ نہ کبھی رات کے سناٹے میں وُہ مردان شاہ کے بیٹوں کے کمروں میں دیکھی گئی۔ نہ کبھی نوکروں کی کوٹھریوں کے آس پاس نظر آئی۔

علی مردان شاہ روز بروز اس سے بیزار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں خود بھی اس بیزاری کی کوئی وجہ نہ آتی۔ ایک رات وہ خواب گاہ میں مردان شاہ کے پیر دبا رہی تھی۔ مردان شاہ کو اس روز نیند نہیں آ رہی تھی۔ برابر الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک اس نے پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر دو بل کی طرف دیکھا اور جھنجھلا کر اس زور سے لات ماری کہ وہ لڑھکتی ہوئی نیچے فرش پر جا کر گری۔ مردان شاہ چیخ کر بولا۔

"باہر نکل جا حرام زادی"

لیکن وہ فرش پر دم بخود پڑی رہی۔ آخر مردان شاہ بستر سے اٹھ کر خود اس کے پاس آیا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھولا اور دھکا دے کر باہر نکال دیا۔

"یہاں اب آئی تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گا"

مردان شاہ نے دروازہ بند کیا اور غصے سے بڑبڑاتا ہوا جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ نیند اب اور بھی زیادہ اڑ چکی تھی۔ وہ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ دو بل پھر واپس نہ آئی۔ حالانکہ مردان شاہ کو یقین تھا کہ وہ آئے گی ضرور۔ مگر اس کا اندازہ غلط نکلا۔ اسے اور بھی زیادہ غصہ آیا۔

رات کے پچھلے پہر وہ کمرے سے نکل کر باہر آیا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ اس نے حویلی کا ایک چکر لگایا۔ مگر وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس طرف چل دیا۔ جہاں حویلی کے ملازمین کی کوٹھریاں تھیں۔ ایک دیوار کے پاس اسے اندھیرے میں کسی کا سایہ نظر آیا۔ مگر جب وہاں پہنچا تو کوئی تیزی سے چلتا ہوا۔ اس کے قریب سے گزر گیا۔ مردان شاہ اسے اندھیرے میں پہچان نہ سکا۔ البتہ دوبل کھڑی تھی۔

مردان شاہ نے جھپٹ کر اپنے چوڑے چوڑے ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچی اور گھسیٹتا ہوا اس نیم تاریک تہہ خانے میں لے گیا جس کی دیواریں سیلی ہوئی تھیں۔ اور جہاں تیز بساند پھیلی تھی۔ اس نے کانسی کا وہ بھدا چراغ روشن کیا۔ جسے تہہ خانے کے بجائے میوزیم میں ہونا چاہیئے تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ دوبل کے سارے کپڑے اتارے۔ طاق میں رکھا ہوا زنبور اور لوہے کا گول ٹکڑا اٹھایا۔ لوہے کے ٹکڑے کو زنبور میں دبایا اور چراغ کی لو سے اسے گرم کرنے لگا۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

جب لوہا دہکنے لگا تو مردان شاہ نے اس کے بال پکڑ کر چہرہ سامنے کیا۔ دوبل نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ لیکن جب اس نے رخسار پر دہکتا ہوا لوہا لگایا تو دوبل کی چیخ نکل گئی اور جب اس نے سینہ داغا تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

سویرا ہونے سے پہلے جب وہ دوبل کو حویلی سے دھکے دے کر باہر نکال رہا تھا تو اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا "سائیں میں اب کہاں جاؤں؟" مگر مردان شاہ ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ اس نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ وہ تیزی سے مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

وہ دن چڑھے تک پڑا سوتا رہا۔ لیکن آنکھ کھلتے ہی اُسے اچانک دوبل یاد آگئی۔ وہ شرمیلی سی لڑکی جسے پیار سے وہ بلی کہتا تھا۔ مگر وہ بستی سے نکل کر ایسی غائب ہوئی کہ تلاش کرنے پر بھی اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔

مردان شاہ تمام دن اداس رہا وہ اب پچھتا رہا تھا کہ اس نے بہت برا کیا۔ وہ پہلی لڑکی تھی جس کا جسم داغ کر اس نے دکھ محسوس کیا تھا۔

☆

علی مردان شاہ کو اب یہ مراق ہو گیا تھا کہ اکثر راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں رات کے

سناٹے میں بیٹھا چاند کو تکا کرتا۔ حویلی میں دوبل کی جگہ ایک اور لڑکی آگئی تھی۔ وہ بھرپور جوان تھی اور بڑی طرح دار تھی مگر مردان شاہ کو اس سے زیادہ لگاوٹ یا رغبت پیدا نہ ہو سکی۔ اسی کوفت میں وہ بیمار پڑ گیا۔

شروع میں وہ گاؤں کے حکیم سے علاج کراتا رہا مگر جب افاقہ نہ ہوا تو شہر سے ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس کے علاج سے بھی مرض میں کمی نہ ہوئی تو دوسرے ڈاکٹروں سے رجوع کیا گیا۔ علاج معالجہ ہوتا رہا۔ مگر مردان شاہ کی صحت برابر گرتی جا رہی تھی۔ اس کا جسم زردی مائل ہو گیا تھا۔ چیتے کی طرح تیز چمکتی ہوئی آنکھیں بے رونق ہو گئی تھیں۔ بظاہر اسے کوئی عارضہ نہیں تھا۔ بس کبھی کبھی دورہ پڑتا تھا۔ اس وقت اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ منہ سے کف جاری ہو جاتا۔ آنکھوں میں خون اتر آتا اور گھنی مونچھیں ابابیل کے پروں کی طرح پھڑ پھڑانے لگتیں۔

یہ دورہ اس وقت پڑتا جب اسے کوئی نوجوان اور خوب صورت عورت نظر آتی۔ علی مردان شاہ کا جی چاہتا کہ اس کا چہرہ داغ دے۔ پھر دردناک چیخیں ابھریں اور گوشت کے جھلسنے کی تیز بو ہر طرف پھیل جائے۔ اس وقت اسے وہ تمام لڑکیاں یاد آ جاتیں، جن کے نرم اور نازک جسموں کو اس نے دہکتے ہوئے لوہے سے داغا تھا۔ ان میں دوبل بھی شامل تھی۔ وہ شرمیلی سی لڑکی جو ہر وقت خوف زدہ نظر آتی تھی اور جواب قریب کی بستی میں ایک کھنڈر کی دیوار تلے پڑی سسک رہی تھی۔ اس کا جسم سڑنے لگا تھا اور چہرہ دیکھ کر خوف معلوم ہوتا تھا۔

علاج معالجہ کا سلسلہ چلتا رہا۔ مگر کسی ڈاکٹر یا حکیم کے علاج سے شفا نہ ہوئی۔ مردان شاہ کی طبیعت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی گئی۔ انھی دنوں اس کی پہلی بیوی کا بڑا بھائی ایک ماہر نفسیات کو اپنے ہمراہ لایا۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ وضع قطع سے خبطی معلوم ہوتا تھا۔ اُسے حویلی سے متصل مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا جس کے ایک حصے میں اوطاق تھا، جہاں ہر شام علی مردان شاہ محفل آرائی کرتا تھا۔ لیکن جب سے وہ بیمار ہوا تھا اوطاق ویران پڑا تھا۔

ماہر نفسیات نے پہلے روز مردان شاہ سے کوئی بات نہیں کی۔ صرف اس کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کرتا رہا۔ دوسرے روز مردان شاہ سے اس نے کرید کرید کے اس طرح سے سوالات کئے جیسے عدالت میں وکیل، ملزم سے جرح کرتے ہیں۔ مردان شاہ کو ان سوالات سے بڑی الجھن ہوتی

کبھی کبھی وہ جھنجھلا کر کھڑا ہو جاتا۔ اپنے بال نوچنے لگتا یا صرف بے بس ہو کر آنکھیں بند کر لیتا اور دیر تک اسی عالم میں بیٹھا رہتا۔ کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر ایک روز باتیں کرتے کرتے ماہر نفسیات کو نہ جانے کون سا سراغ مل گیا کہ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ چٹکی بجا کر بولا۔

" شاہ جی! اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھیے آپ کا مرض اب ختم ہو گیا۔ بس چند دنوں کی بات ہے۔"

مردان شاہ کو بھی اس کی باتوں سے قدرے اطمینان ہوا اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن علاج ہنوز شروع نہ ہو سکا۔ ماہر نفسیات کو نئے چاند کے طلوع ہونے کا انتظار تھا۔ آخر جب دوسرے مہینے چاند نکلا تو حویلی کی چھت پر سر شام ہی ایک بڑا سا ٹب رکھوا دیا گیا۔ اس میں صاف ستھرا پانی بھرا تھا۔ ٹب کے نزدیک آمنے سامنے دو آرام کرسیاں ڈال دی گئیں۔ ایک پر مردان شاہ کو بٹھایا گیا اور دوسری پر خود ماہر نفسیات بیٹھا۔ مردان شاہ اس کی ہدایت کے مطابق ٹکٹکی باندھے ٹب کے اندر چاند کے عکس کو تکنے لگا۔

یہ سلسلہ نہایت پابندی سے چلتا رہا۔ شروع شروع میں تو مردان شاہ کو تھوڑی دیر بعد فرصت مل جاتی۔ اس لیے کہ چاند غروب ہوتے ہی دونوں اٹھ جاتے۔ لیکن جب چاندنی راتیں طویل ہو گئیں تو یہ عمل مردان شاہ کو بہت شاق گزرتا۔ اب چاند کا دائرہ روز بروز مکمل ہوتا جا رہا تھا۔ مردان شاہ چاند کو تکتے تکتے اونگھنے لگتا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ جاتا۔ اور وہ بے چینی کے عالم میں آرام کرسی پر پہلو بدلنے لگتا۔ اسی وقت ماہر نفسیات پانی کی سطح پر کنکری پھینکتا۔ ٹب کے اندر بھرے ہوئے پانی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا۔ چاند کا جھلکتا ہوا گول مٹول چہرہ شیشہ کی طرح ٹوٹ کر چکنا چور ہو جاتا۔ مردان شاہ پر اس کا فوری ردِ عمل یہ ہوتا کہ اس کی رگ رگ میں ایک نئی حرارت، ایک نئی توانائی آ جاتی۔ اس کی آنکھیں انتہائی مسرت سے چمک اٹھتیں۔

ماہر نفسیات خاموش بیٹھا اس کی ہر ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتا رہتا۔ رات بھر میں وہ بار بار ٹب میں کنکریاں پھینک کر چاند کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا رہتا۔ ابتدا میں تو اس کی حرکت سے مردان شاہ کو بڑا لطف آتا۔ لیکن چند روز بعد اس کا ردِ عمل بالکل مختلف ہوا۔

یہ چاند کی اترتی تاریخیں تھیں۔ راتیں بڑی سہانی ہوتیں۔ ہلکی اور خنک ہوائیں سرسراتی ہوئی

چلتیں۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوتی۔ ایک ایسی ہی خوبصورت رات کا ذکر ہے۔ ماہر نفسیات نے پانی کی سطح پر کنکری پھینکی تو اس کی یہ حرکت مردان شاہ کو بڑی ناگوار معلوم ہوئی۔ اس کی بھنویں تن گئیں اور وہ گھور کر ماہر نفسیات کو دیکھنے لگا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ کہا۔ دوبارہ جب اس نے یہی حرکت کی تو وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پانی میں کنکری گرنے کے ساتھ ہی مردان شاہ تکلیف سے آنکھیں بند کر لیتا۔

اس روز وہ تمام رات اس تکلیف سے دوچار ہوتا رہا۔ دوسرے روز اس کی یہ تکلیف اور بڑھ گئی۔ پھر تو اس کا یہ عالم ہو گیا کہ ادھر ماہر نفسیات نے کنکری پھینکنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور وہ جھٹ اس کا ہاتھ تھام لیتا۔ کبھی خوشامد کرتا۔ کبھی جھنجھلاہٹ اور خفگی کا اظہار کرتا۔ کبھی اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا۔ مگر ماہر نفسیات اسے جانے نہ دیتا۔

یہ سلسلہ بھی کئی دن چلتا رہا۔ اب چاند ڈھلنے لگا تھا اور مردان شاہ رفتہ رفتہ ہر عمل کا عادی بنتا جا رہا تھا۔ اس کے لیے ہر حرکت ایک عام سی بات بن گئی تھی۔ نہ اس کے چہرے پر کوئی غیر معمولی تاثر پیدا ہوتا نہ آنکھوں کا انداز تبدیل ہوتا۔ جب یہ مرحلہ آ گیا تو ایک روز ماہر نفسیات نے اعلان کر دیا کہ وہ بالکل صحت مند ہو چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اب اس کا جسم پہلے کی طرح فربہ ہو گیا تھا اور چہرے پر تازگی آ گئی تھی۔

جب مردان شاہ کے صحت یاب ہونے کا مژدہ سنایا گیا تو حویلی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف گہما گہمی پیدا ہو گئی۔ دن بھر لوگ آ آ کر اسے مبارک باد دیتے رہے۔ چھ بکرے ذبح کئے گئے اور ان کا گوشت بستی کے غربا میں تقسیم کر دیا گیا۔ مسجد کے ملّا کو نیا جوڑا دیا گیا۔ مردان شاہ نے اس روز لباس میں خاص اہتمام کیا تھا۔ رات ہونے سے کچھ دیر پہلے ماہر نفسیات کو ۲۹۲۷ روپے کے بل کے علاوہ مردان شاہ نے ایک ہزار روپے بطور انعام دیا اور اپنی نئی کیڈلک میں بٹھا کر شہر بھجوا دیا۔

میرل ٹھاکری نے اس روز مردان شاہ کے لیے ایک خوش شکل لڑکی بھی مہیا کی تھی۔ وہ شوخ اور کسی قدر نڈر تھی۔ عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ شادی شدہ تھی مگر اس کی شادی کو دو مہینے بھی نہ گزرے تھے۔ اس کا نام جنّت تھا اور میرل اسے نگسیوں کے گاؤں سے اٹھا کر لایا تھا۔ مردان شاہ نے اسے بہت پسند کیا۔ اس رات وہ جلد ہی اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

جنت کو حویلی میں آئے ہوئے پانچواں روز تھا۔ رات کے پچھلے پہر مردان شاہ کی آنکھ کھلی تو جنت کمرے سے غائب تھی۔ مردان شاہ سخت برہم ہوا۔ وہ بپھرا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور دیوانوں کی طرح اسے تلاش کرنے لگا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس اطلاع سے حویلی میں ایک بار پھر کھلبلی پڑ گئی۔ ہر شخص خوف زدہ نظر آنے لگا۔

کمدار محمد عرس ملکانی نے ایک بار پھر کارگزاری دکھائی۔ وہ دو ہوشیار اور مستعد کارندوں کے ہمراہ نکلا اور گھنٹہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ جنت کو لاکر علی مردان شاہ کے روبرو پیش کر دیا۔ وہ اُسے اسٹیشن سے پکڑ کر لایا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی مردان شاہ کی آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح خون اتر آیا۔ اسی وقت اسے سیلی ہوئی دیواروں والے نیم تاریک تہہ خانے میں بھجوا دیا گیا۔ ذرا دیر بعد مردان شاہ بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دیوانگی کے عالم میں لڑکی کے رخسار اور سینے کو داغا اور سویرا ہونے سے پہلے ہی دھکے دے کر حویلی سے نکال دیا۔

لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اس کا غصہ کم نہ ہوا۔ اس نے ماہر نفسیات کو ہزاروں گالیاں دیں۔ ایک ملازم کی کمر پر خواہ مخواہ ٹھوکریں ماریں۔ کمرے کے اندر رکھے ہوئے شیشے کے تمام گلاس فرش پر پھینک پھینک کر چکنا چور کر دیئے۔ دیر تک غیظ و غضب کے عالم میں چیختا چلاتا رہا اور پھر نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔

کئی روز گزر گئے۔ میرل ابھی تک علی مردان شاہ کے لئے کسی نئی داشتہ کا بندوبست نہیں کر سکا تھا۔ اس روز مردان کی طبیعت بہت مضمحل تھی۔ وہ تمام دن اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ نہ کسی سے بات چیت کی نہ شام کو اوطاق میں گیا۔ بستر پر آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔

رات آدھی ہو گئی۔ حویلی پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ یکایک ملی جلی آوازوں کا شور بلند ہوا۔

علی مردان شاہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ گھبرایا ہوا حویلی سے باہر گیا تو بیرونی دروازے پر کمدار ملکانی مل گیا۔ وہ بھی گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ جنت کے شوہر رانجھو مگسی نے اپنے قبیلے کے ساتھ گوٹھ پر حملہ کر دیا ہے۔

ملکانی نے ٹھیک ہی اطلاع دی تھی۔ مگسیوں کا ایک گروہ گاؤں میں داخل ہو گیا تھا۔ انکی تعداد پچاس سے زیادہ نہ تھی۔ مگر سب کلہاڑیوں اور ایسے ہی دوسرے ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ حملہ آوروں

کے ہجوم میں رانجھو آگے آگے تھا۔ وہ تھا تو ہاری لیکن تگڑا اور سرکش نوجوان تھا۔ اس نے جب سے اپنی بیوی کی بپتا سنی تھی، اسی وقت سے انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

علی مردان شاہ نے کمدار ملکانی کو ضروری ہدایات دیں اور واپس حویلی میں چلا گیا۔ سکر وہ خوفزدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا۔

حملہ آور شور مچاتے ہوئے اندھیرے میں برابر آگے بڑھ رہے۔ یکایک بندوق چلنے کی آواز اُبھری۔ حملہ آوروں میں کھلبلی پڑ گئی۔ کچھ سراسیمہ ہو کر بھاگے۔ کچھ درختوں کی اوٹ میں دبک گئے دوسری بار گولی چلی تو حویلی کے سامنے سے ہجوم چھٹ چکا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ پھر شور کرتے وہاں اکٹھا ہو گئے۔ حویلی کے قریب سے پھر گولیاں برسنے لگیں۔ لیکن اس دفعہ دوسری طرف سے پتھر آ آ کر حویلی کی کھڑکیوں اور دروازوں سے ٹکرانے لگے۔ ایک پتھر مردان شاہ کے شانے سے چھلتا ہوا گزر گیا۔ وہ بدحواس ہو کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔

رات کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ باہر ملی جلی آوازوں کا شور برپا تھا۔ گولیاں چیخ رہی تھیں اور پتھر دھڑا دھڑ آ آ کر حویلی کے در و دیوار سے ٹکرا رہے تھے۔ اسی اثنا میں حویلی کے اندر ملی جلی آوازوں کے ساتھ قدموں کا شور سنائی دیا۔

مردان شاہ کمرے کا دروازہ بند کرنے کے لیئے اٹھا ہی تھا کہ اسی وقت کئی آدمی اندر گھس آئے ان میں رانجھو مگسی بھی شامل تھا۔ علی مردان شاہ کو دیکھتے ہی وہ دیوانہ ہو گیا۔ تیزی سے آگے بڑھا اور اس کی گردن دبوچ لی۔ اٹھایا اور اُسے کوئلہ کی بوری کی طرح پختہ فرش پر پٹک دیا۔ پھر رانجھو نے لاتوں اور گھونسوں سے اس کی مرمت شروع کر دی اس کے منہ پر اس زور سے جوتے کی ٹھوکر ماری کہ ایک رخسار کی کھال کٹ گئی اور اس میں سے خون کا فوارہ ابل پڑا اس کے بعد مردان شاہ بیہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا تو علی مردان شاہ نے دیکھا کہ اس کے ارد گرد ملازموں کے علاوہ پولیس والے بھی موجود تھے۔ کمرے میں ہر طرف ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا تھا۔ حویلی میں گہری خاموشی تھی۔ سناٹا تھا۔ تھانیدار نے دلجوئی کرتے ہوئے اُسے بتایا کہ رانجھو مگسی اور اس کے تین بھائیوں کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے حملہ آوروں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ لیکن مردان شاہ کے چہرے پر ایسی کاری ضرب لگی تھی کہ اس کا ایک گال پھول کا غبارہ بن گیا تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکا۔ علی مردان شاہ کو اسی

وقت کار میں ڈال کر اسپتال پہنچایا گیا جہاں اس کے زخم پر پانچ ٹانکے لگائے گئے۔

ہفتہ بھر بعد جب وہ اسپتال سے نکلا تو زخم مندمل ہو چکا تھا۔ البتہ چہرے پر اس کا نشان باقی رہ گیا تھا۔ یہ ہلال کی طرح نصف دائرہ میں بنا ہوا سیاہ داغ تھا۔ غالباً رانجھو مگسی کے جوتے کی ایڑی میں لوہے کی نعل جڑی ہوئی تھی جو مردان شاہ کے چہرہ پر اپنی پوری چھاپ چھوڑ گئی تھی۔

اس حادثہ کو اب تین سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ رانجھو مگسی اور اس کے تینوں بھائیوں کے علاوہ کئی دوسرے حملہ آور ابھی تک جیل میں ہیں۔ بستی کے لوگ مردان شاہ سے اور بھی زیادہ خائف رہنے لگے ہیں مگر اس عرصہ میں مردان شاہ نے کسی لڑکی کے جسم کو دہکتے ہوئے لوہے سے نہیں داغا۔ حالانکہ میرل ٹاٹری اس کے لئے ابھی تک نت نئی لڑکیاں مہیا کرتا رہتا ہے۔

مردان شاہ کا عجیب و غریب مرض، جس کا علاج حکیموں، ڈاکٹروں اور ماہر نفسیات سے بھی نہ ہو سکا، اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رفع ہو چکا ہے۔ لیکن اسے یہ فکر برابر ستاتی رہتی ہے کہ اپنے چہرے کا وہ بدنما داغ کسی طرح مٹا دے جو دیکھنے والے کو دور سے نظر آتا ہے۔

اُستادِ محترم

پروفیسر کیانی نے مطالعہ کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا لیکن کمرے کے اندر نظر پہنچتے ہی دہلیز پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ سامنے فرش پر اس کا نوجوان شاگرد دارا شکوہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف بے ترتیبی سے کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

لمحہ بھر وہ دروازے کے قریب چپ چاپ کھڑا رہا، پھر نہ جانے کیا سوچ کر وہ پلٹا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ لیکن اس نے سو، سوا سو گز فاصلہ طے کیا ہوگا کہ خودبخود اس کے قدم رک گئے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اب وہ جائے گا کہاں؟ اس وقت تو اسے اپنے مطالعے کے کمرے میں ہونا چاہیئے تھا۔ گھر سے باہر رہنے کے واسطے اس نے جو وقت مقرر کیا تھا، وہ اب ختم ہو چکا تھا۔

اس روز بھی وہ ٹھیک دس بجے واپس آگیا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ رات کا کھانا کھانے کے بعد گھر سے باہر چلا جاتا اور چہل قدمی کرتا ہوا ایڈورڈ کے بت تک جاتا۔ پارک کا چکر لگاتا اور واپسی پر علی محمد ٹیلر ماسٹر کی دکان کے ساتھ والے چائے خانے میں ایک پیالی، گرم گرم چائے کی پیتا۔ چائے خانے سے نکل کر وہ اس سڑک سے ہوتا ہوا گھر کی جانب لوٹتا جس پر دن کے وقت رکشہ چلانے پر چالان ہو جاتا تھا۔ اس کے اس پروگرام میں کبھی فرق پیدا نہیں ہوا۔

ذرا دیر بعد وہ پھر گھر میں واپس پہنچ گیا۔ مطالعے کے کمرے کے دروازہ پر پہنچ کر اس نے دیکھا لیمپ کی اجلی روشنی میں دارا ابھی تک بے سدھ پڑا تھا۔ پروفیسر نے جوتے اتار کر بغل میں دبائے اور چوروں کی طرح دبے دبے قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔

جوتے ایک طرف رکھ کر اس نے سلیپر پہنے اور کرسی پر تھکا ہوا سا جا کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اس وقت کچھ حبس معلوم ہو رہا تھا۔ باہر کھلنے والی دونوں کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ ان کو کھولنے

کے ارادے سے اٹھا۔ مگر اس خیال سے وہاں تک نہ جا سکا کہ کہیں آہٹ سے دارا کی آنکھ نہ کھل جائے جو بازو پر سر رکھے مزے سے سو رہا تھا۔

پروفیسر کو اس کا اس طرح بے تکے پن سے سونا کچھ مناسب نہ معلوم ہوا۔ تکیہ وہاں کوئی موجود نہ تھا، لہٰذا اس نے کرسی کا کشن اٹھایا اور اسے سنبھالے ہوئے دارا کے قریب پہنچ گیا۔ آہستہ سے اس کا سر اٹھایا اور کشن رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی اس حرکت سے دارا کی آنکھ کھل گئی وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے پروفیسر کو دیکھنے لگا وہ شرمسار ہو کر گویا ہوا۔

"میں ہرگز تمہاری نیند میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا مگر تم بے ڈھنگے پن سے سو رہے تھے لو یہ کشن سر کے نیچے رکھ لو اور نیند کا لطف خراب نہ کرو۔"

ادھر دارا خود شرمندہ تھا کہ وہ پڑھتے پڑھتے اس طرح فرش پر سو کیوں گیا۔ آہستہ سے بولا: "جی وہ ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ بات یہ ہوئی کہ کل رات میں بہت دیر سے سویا تھا۔"

پروفیسر نے ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا: "تم یہاں کس وقت آئے؟"

دارا نے جواب دیا: "آپ کے جاتے ہی آگیا تھا۔ کلّو نے یہی بتایا تھا۔"

پروفیسر کے چہرے پر ناگواری کے اثرات پیدا ہوئے۔ جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔ "کہاں ہے وہ کلّو کا بچہ۔ میں نے ہزار دفعہ کہا کہ جب تک میں واپس نہ آجاؤں وہ جاگتا رہے لیکن معلوم ہوتا ہے وہ آج بھی جا کر سو گیا۔"

دارا نے پوچھا: "کہیئے تو اسے جا کر جگا دوں۔"

پروفیسر نے اسے ڈانٹ دیا: "نہیں، سوجانا اس کی غلطی تھی۔ اسے جا کر جگانا تمھاری غلطی ہوگی۔ نیند خراب کرنا ایک مجرمانہ فعل ہے۔"

اس کے بعد کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ دارا چپ چاپ فرش پر بکھری ہوئی کتابیں سمیٹنے لگا۔ اسی اثنا میں پروفیسر نے پوچھا۔

"کیا پڑھ رہے تھے تم؟"

دارا نے جواب دیا: "سولیئر کا آوائسے پڑھ رہا تھا۔ مولیئر کے متعلق پروفیسر آپ کا کیا خیال ہے؟"

اس نے گہری نظروں سے دارا کو دیکھا اور بتانے لگا "مولیئر کے متعلق کوئی دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ عالمی ادب میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ گوئٹے نے کہا تھا۔ مولیئر اس قدر عظیم ہے کہ اسے جب بھی پڑھو، ہر بار نئی مسرت کا احساس ہوتا ہے۔"

دارا کہنے لگا "میں نے آج ہی اسے شروع کیا تھا۔ سوچا تھا کہ ختم کر لوں تو آپ سے اس کے متعلق گفتگو کروں گا۔"

پروفیسر بولا "اس بات سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ تمہارا ادبی ذوق اب پاکیزہ ہوتا جا رہا ہے۔ مجھے ایسے طلبا سے چڑھ ہے جو لندن ٹائمز کے لٹریری سپلیمنٹ یا اسی قبیل کے کسی اور اخبار یا رسالے میں کسی کتاب پر ریویو پڑھ کر الٹی سیدھی کوئی کتاب خرید لاتے ہیں اور اسے پڑھ کر خواہ مخواہ انٹلکچوئیل بننے کی کوشش کرتے ہیں۔"

دارا نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے۔"

پروفیسر اس وقت گردن جھکائے اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا اس نے فوراً اسے ٹوک دیا۔ "فی الحال تمہارا کوئی خیال نہیں۔ گیارہ بج چکے ہیں۔ اب مزید گفتگو نہیں ہوگی۔"

لیکن دارا باز نہ آیا کہنے لگا "میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں۔"

پروفیسر نے پھر اس کی بات کاٹ دی "میں نے کہہ دیا۔ مسٹر! اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ میں امتحان کی کاپیاں دیکھوں گا۔ جب تک تمہارا جی چاہے بیٹھے پڑھتے رہو۔ اس کے بعد چپ چاپ چلے جانا۔"

دارا نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔ پروفیسر نے اٹھ کر الماری کا تالا کھولا۔ امتحان کی کاپیاں نکالیں اور میز پر جھک کر انہیں دیکھنے لگا۔ کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔

پروفیسر دیر تک بیٹھا کاپیاں دیکھتا رہا۔ سرخ پنسل سے جگہ جگہ مختلف نشان بناتا رہا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ زور زور سے بڑبڑانے لگا۔

"جاہل، نامعقول، میں اس بات کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

دارا نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھنے لگا "کچھ مجھ سے کہا آپ نے؟"

پروفیسر نے گھور کر اسے دیکھا اور ناراض ہو کر بولا "کیا تم بھول گئے کہ ابھی میں نے کہا تھا کہ تم کوئی بات نہیں کرو گے۔" اس نے قدرے توقف کیا پھر ذرا دھیمے لہجے میں گویا ہوا "تمہیں

بھی یہ بات معلوم ہونا چاہیئے۔ یہ ایک ایسے طالب علم کی کاپی ہے جو انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری لینا چاہتا ہے اور اس نالائق کو شیکسپیر کے نام کے ہجے تک نہیں آتے۔ اس کو ایک نمبر نہیں دوں گا۔ صرف صفر۔ یہ سراسر جہالت ہے۔ میں اسے ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔"

دارا نے جھجکتے ہوئے کہا "لیکن پروفیسر صاحب! یہ تو بڑی ناانصافی ہوگی۔"

پروفیسر اور بھی بپھر گیا۔ تیز لہجے میں بولا "تمہارے نزدیک یہ زیادتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کوئی غلط اقدام کر رہا ہوں۔"

دارا نے اس دفعہ بھی دھیمے لہجے میں کہا "یہ میرا مطلب ہرگز نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ کچھ مارکس کاٹ لیں۔"

پروفیسر بگڑ کر بولا "تمہارا خیال بالکل احمقانہ ہے۔ مسٹر! یہ ادب ہے۔ اس کی اقدار صدیوں میں وضع ہوتی ہیں۔ یہ ریگستان میں آلو اگانے کا تجربہ نہیں ہے۔"

دارا نے برجستہ جواب دیا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شیکسپیر کو پڑھنے کے بعد، ریگستان میں آلو اگانے کا تجربہ کرنا پڑے۔ آپ نے ادبی اقدار تو وضع کر لیں۔ لیکن انسانی محنت کی اقدار وضع نہ کر سکے۔"

پروفیسر اسے ایک ٹک گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر بولا "تمہارے خیالات کچھ اشتراکی ہوتے جا رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمہارا معدہ کچھ گڑبڑ ہے۔ معدے کے فتور ہی سے ہمیشہ اس طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ تم فوراً سر بَل ہو جاؤ۔"

دارا خاموش بیٹھا رہا۔

پروفیسر نے دوبارہ کہا "میں کہتا ہوں تم سر بَل ہو جاؤ۔"

وہ بولا "سر! میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

"میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ تم سر کے بل کھڑے ہو جاؤ۔" پروفیسر نے وضاحت کی۔ "یہ یوگا کا بڑا کارآمد آسن ہے۔ اس سے خون دماغ کی شریانوں میں تیزی سے گردش کرنے لگتا ہے۔ اس سے معدے کو تقویت اور دماغ کو فرحت ملتی ہے۔ تم روزانہ کچھ دیر تک یہ آسن لگایا کرو۔"

دارا شکوہ کے لئے یہ لمحہ بڑا عبرت ناک تھا۔ اس کے نزدیک یہ سراسر حماقت تھی مگر مصیبت

پر تھی کہ وہ پروفیسر کے حکم کو بھی نہیں ٹال سکتا تھا۔ وہ ذرا دیر تک تذبذب کے عالم میں گم صم بیٹھا رہا۔ لیکن جب پروفیسر اس کے سر ہی ہو گیا تو مجبوراً اس نے پروفیسر کی ہدایت کے مطابق سر جھکا کر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر ٹکایا اور ٹانگیں اونچی کرنے لگا۔ پہلے سے چونکہ مشق نہ تھی لہٰذا ٹانگیں بلند کرتے ہی جسمانی توازن برقرار نہ رہ سکا۔ وہ قلابازی کھا کر میز پر جا گرا جو شور کرتی ہوئی الٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کئی کرسیاں، کتابیں اور ایسی دوسری اشیاء لڑھکتی ہوئی فرش پر بے ترتیبی سے بکھر گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرہ کباڑیے کی دکان بن گیا، پروفیسر کو سخت غصہ آگیا۔ بگڑ کر بولا۔

"تم انسانی محنت کی اقدار کی باتیں کرتے ہو اور تم کو سر کے بل کی بھی تمیز نہیں۔ اب تم ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً کمرے سے باہر چلے جاؤ۔"

دارا نے، جو بقول پروفیسر کے اشتراکی خیالات رکھتا تھا، اسی میں عافیت سمجھی کہ فوراً کمرے سے چلا جائے۔

اس کے جانے کے بعد پروفیسر بے چینی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

ٹہلتے ٹہلتے ایکا ایکی اُسے خیال آیا کہیں اس نے داراشکوہ کو کمرے سے باہر نکال کر کوئی نازیبا حرکت تو نہیں کی۔ جتنا زیادہ وہ اس بات پر غور کرتا گیا اسی قدر یہ گمان قوی ہوتا گیا کہ اس کا اقدام مناسب نہیں تھا اور جب یقین ہو گیا کہ اس کی حرکت درست نہیں تھی تو وہ اپنے متعلق سوچنے لگا کہ کہیں اس کا معدہ تو خراب نہیں ہے۔ ورنہ ایسی نازیبا بات اس کے ذہن میں کیوں آتی۔ ضرور کوئی ایسی ہی گڑبڑ ہے۔ اس نے فوراً جسم پر سے تمام کپڑے اتارے اور صرف انڈرویئر پہنے ہوئے فرش پر سر کے بل کھڑا ہو گیا۔

اس عالم میں مشکل سے چند منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک کمرے کے باہر بھاری بھاری قدموں سے چلنے کی آواز سنائی دی۔ پروفیسر آواز پر پوری طرح توجہ بھی نہ دے پایا تھا کہ اسی اثنا میں تین لحیم شحیم آدمی کمرے کے اندر گھس آئے۔ انھوں نے کمرے کے بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا۔ سر کے بل کھڑے ہوئے نیم برہنہ پروفیسر کو دیکھا اور حیرت سے وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔

پروفیسر اسی طرح آسن جمائے سر کے بل کھڑا رہا۔ تینوں عین اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے ان کی وضع قطع کا جائزہ لیا اور بڑی بے نیازی سے بولا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ غلط جگہ آگئے ہیں۔ یہ پروفیسر صفدر علی کیانی کا مکان ہے کسی پٹواری کی بیٹھک نہیں ہے۔ آپ براہ کرم باہر چلے جائیں۔ میں اس قسم کے دخل درمعقولات ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

انھوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور پھر ان میں سے کسی نے کہا "یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"نہیں جی، یہ تو کوئی اور لگتا ہے۔ اس کا حلیہ تو کچھ اور بتایا تھا۔"

"ڈاڑھی تو ویسی ہی نوک دار ہے اور سر بھی گنجا ہے۔"

جس آدمی نے یہ بات کہی تھی بڑھ کر پروفیسر کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھنے لگا۔

"تم ہی پروفیسر ہو؟"

پروفیسر بگڑ کر بولا: "ہاں میرا نام پروفیسر کیانی ہے۔ لیکن تم مجھ سے ملنے ہرگز نہیں آسکتے۔ میں نے کہہ دیا کہ تم غلط جگہ آگئے ہو۔"

وہ بولا "تم آدمی کی طرح تو کھڑے ہو۔"

پروفیسر اپنی بات پر اڑا رہا: "تم سے جو کہنا تھا میں نے کہہ دیا۔ میں ۲۵ منٹ سے پہلے آسن نہیں چھوڑ سکتا۔ ابھی صرف پانچ منٹ گزرے ہیں۔ اس آسن کی مقررہ مدت نصف گھنٹہ ہے۔ اگر درمیان میں ختم کر دیا جائے تو بینائی پر برا اثر پڑتا ہے بلکہ ریڑھ کی ہڈی پر بھی ضرب لگ جانے کا خدشہ ہے۔"

وہ ابھی آسن کے متعلق نہ جانے کتنی دیر گوہر افشانی کرتا۔ مگر وہ تینوں لحیم شحیم اجنبی، جو وضع قطع سے بالکل اُجڈ معلوم ہوتے تھے، اس کی بلاغت سے استفادہ نہ کر سکے۔ بلکہ اس آدمی نے، جو اس کے پاس کھڑا تھا، پروفیسر کی کمر دونوں ہاتھوں سے پکڑی۔ اوپر اٹھایا اور اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔

پروفیسر غضب ناک ہو کر بولا "یہ قوت کا بے جا استعمال ہے۔ آپ نے سخت چھچھورے پن کا مظاہرہ کیا ہے۔"

وہ آدمی بولا "بس اب تم ہمارے ساتھ چپ چاپ چلے چلو۔"

پروفیسر حیرت زدہ ہو کر بولا "کہاں؟"

"جہاں ہم لے جائیں۔"

"میں تو صبح ۷ بجکر ۲۵ منٹ سے پہلے گھر سے نہیں نکل سکتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہم نکال لے چلیں گے۔" اتنا کہہ کر اس نے پروفیسر کا بازو پکڑا اور دروازے کی جانب گھسیٹتے ہوئے بولا "بس اب خاموشی سے چلے چلو۔ خواہ مخواہ چوٹ چپیٹ آجائے گی۔"

پروفیسر ایک ہی جھٹکے میں حواس باختہ ہو گیا۔ کہنے لگا "لیکن میں اس حلیہ میں کیسے چل سکتا ہوں۔ کپڑے تو بدل لوں۔"

"بس یونہی چلے چلو۔ ہم کو تو حکم ملا ہے کہ جس طرح بیٹھے ہو اسی حالت میں لے آؤ۔"

پروفیسر بولا "کس نے یہ حکم دیا؟"

"اب چل کر خود ہی دیکھ لینا۔"

پروفیسر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ان میں سے ایک نے لپک کر اسے بازوؤں پر اٹھا لیا۔ وہ غصے سے چیخ کر بولا "یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

دوسرے نے اپنا چوڑا چکلا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

وہ اسے بازوؤں پر اٹھائے ہوئے گھر سے باہر لے آئے۔ دروازے پر ایک لمبی سیاہ کار کھڑی تھی۔ انہوں نے پروفیسر کو کار کے اندر ڈال دیا۔ ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ کار اسٹارٹ ہوئی آن کی آن میں تیزی سے دوڑنے لگی۔ کچھ دیر تک پروفیسر گم صم بیٹھا رہا، پھر اس نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دو آدمی منکر نکیر کی طرح اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ ایک اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا۔

وہ سوچنے لگا۔ آخر یہ تینوں مجھے اس طرح زبردستی کہاں لئے جا رہے ہیں۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا۔ میں نے کون سا ایسا جرم کیا۔ جس کی پاداش میں مجھے اس طرح اغوا کیا گیا ہے یہ اور اسی قسم کے نہ معلوم کتنے ہی سوالات اس کے ذہن میں چوہوں کی طرح بلوں سے منہ نکال نکال کر جھانکنے لگے۔

کچھ دیر بعد کار ایک پٹرول پمپ کے قریب جا کر رکی۔ تینوں ڈرائیور سمیت اتر کر باہر چلے گئے کار کا دروازہ کھلا تھا۔ پروفیسر نے جھجکتے ہوئے جسم کا تھوڑا سا حصہ باہر نکالا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا موقع غنیمت ہے۔ اگر تھوڑی سی ہمت سے کام لیا جائے تو ان مشٹنڈوں کی حراست سے نجات مل جائے گی۔ کچھ یہی سوچ کر وہ کار سے باہر آ گیا۔ قریب ہی ایک ٹرک کھڑا تھا۔ پروفیسر کیا نی اس کی اوٹ میں دبکا ہوا چونکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور جھک کر ٹرک کی اگلی سیٹ پر جا بیٹھتے ہوئے بولا:

"یار تیرا کلینر کہاں ہے؟"

اسی وقت اس کی نظر پروفیسر پر جا پہنچی۔ اس نے ننگ دھڑنگ دبلے پتلے پروفیسر کو دیکھا جو خالی انڈر ویئر پہنے بالکل اُلّو کا پٹھا نظر آ رہا تھا۔ وہ آدمی ڈپٹ کر بولا "ہم تجھے اندر دیکھ رہے ہیں اور تو یہاں کھڑا ہے۔ چل ڈبا اٹھا!"

پروفیسر اس بدتمیزی پر جل بھن کر کباب ہو گیا، مگر اس شخص نے پروفیسر کی ناراضگی پر توجہ دیئے بغیر، گردن پر ہاتھ رکھ کر زور سے دھکا دیا۔ پروفیسر گرتے گرتے بچا۔

"ابے چل رہا ہے یا لگاؤں سالے کے ایک ہاتھ۔"

پروفیسر سہم کر رہ گیا۔ چپ چاپ اس کے ہمراہ چل دیا۔ اس نے موبل آئل کا ڈبا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پروفیسر نے ڈبا لا کر ٹرک کے پاس رکھ دیا۔ اب فرار ہونے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ وہ چاروں سامنے ہی کھڑے تھے۔ وہ خاموشی سے مڑا اور کار کی پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ سوچا، زیادہ دیر باہر رہا تو نہ جانے اور کیا مصیبت نازل ہو۔

ذرا ہی دیر بعد وہ چاروں واپس آ گئے۔ وہ اس وقت خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے سب کار میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ ایکسیلیٹر دبایا اور کار فراٹے بھرتی ہوئی سنسان سڑک پر دوڑنے لگی۔

مشکل سے میل بھر کا راستہ طے ہوا ہوگا کہ انھوں نے پھر کار ٹھہرا لی۔ اس مرتبہ کار کسی چائے خانے کے سامنے کھڑی تھی۔ لیکن کوئی باہر نہیں نکلا۔ ان میں سے ایک نے چائے خانے کے مالک کو آواز دے کر چائے لانے کا آرڈر دے دیا۔ فوراً ہی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی چائے کی پیالیاں اٹھائے

ہوئے کار کے نزدیک آیا۔ اس نے سب کو چائے دی۔ جب پروفیسر کی باری آئی تو وہ اسے کسی قدر حیرت سے دیکھنے لگا۔ برابر بیٹھے ہوئے آدمی نے ڈانٹ کر کہا۔

"ابے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے۔ جھک کر سلام کر۔ جانتا ہے یہ کون ہیں؟ کبھی پیر جھنڈے شاہ کو دیکھا ہے۔ نہیں دیکھا تو دیکھ لے۔ تیرے سامنے بیٹھے ہیں۔"

تینوں اس وقت دل لگی کے موڈ میں تھے۔ مگر ادھیڑ عمر کے بیرے پر اس بات کا نہ جانے کیا اثر ہوا کہ اس نے جھٹ پروفیسر کے پاؤں پکڑ لیے اور گڑگڑانے لگا۔

"سائیں بابا۔ بس ایک عرض ہے۔ صرف اتنی دعا کر دو کہ میری بیٹی گھر آجائے۔ اس کی سسرال والے اپنی ماں کے یار ہیں۔ ایک نمبر بدمعاش ہیں۔ تین سال سے اسے نہیں بھیجا۔"

پروفیسر نے اپنے پاؤں چھڑانے کی کوشش کی۔ جھنجھلا کر بولا "یہ کیا نامعقول حرکت ہے؟"

مگر وہ باز نہ آیا۔ جتنا پروفیسر اس پر ناراض ہوتا وہ اتنا ہی زیادہ خوشامد کرتا۔ اس نئی مصیبت نے پروفیسر کو اس قدر پریشان کر دیا کہ وہ غصے سے چیخنے لگا۔ مگر اس شخص کی ایک ہی رٹ تھی۔ "بس ایک بار اپنی زبان سے کہہ دو۔" پروفیسر نے انتہائی غصے میں اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے لوگ اس چپقلش سے لطف اٹھاتے رہے۔

جب انھوں نے دیکھا کہ خواہ مخواہ کار رکی ہوئی ہے تو ایک نے ادھیڑ عمر بیرے کو جھڑکا۔

"بس، اب جا۔ تیرا کام بن گیا۔ جھنڈے شاہ جس پر تھوک دیں۔ سمجھو اس کا بیڑا پار ہے۔"

وہ شخص دعائیں دیتا ہوا فوراً وہاں سے چل دیا۔ البتہ پروفیسر غصے سے تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ تینوں کو کچا چبا جاتا۔ مگر ان میں سے ہر ایک اس قدر موٹا تگڑا تھا کہ ان کو دیکھ کر ہی وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا۔ کار تیزی سے دوڑتی رہی اور پروفیسر بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ دیکھیے اب کون سی نئی مصیبت نازل ہوتی ہے۔

کوئی نصف گھنٹہ بعد کار ایک بڑی شان دار کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوئی اور برساتی میں پہنچ کر رک گئی۔ پہلے وہ تینوں باہر نکلے۔ پھر انھوں نے پروفیسر کو کار سے باہر آنے کا اشارہ کیا اور اپنے نرغے میں لے کر کشاں کشاں کوٹھی کے اندر چلے گئے۔

وہ ان کی حراست میں ایک پرتکلف کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے صوفے پر ایک بھاری

بھرکم شخص آلتی پالتی مارے بیٹھا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ اس کے جسم پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کا یہ انداز پروفیسر کو ناشائستہ معلوم ہوا۔

وہ اسے دیکھتے ہی بولا "آپ ہی پروفیسر کیانی ہیں؟"

پروفیسر جل کر بولا "جی ہاں! اسی گرفتار بلا کو کیانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"

وہ کہنے لگا "معاف کیجیے گا جی، میں نے آپ کو اس وقت یہاں آنے کی تکلیف دی۔" پھر وہ ان تینوں کی جانب متوجہ ہوا "معلوم ہوتا ہے تم نے پروفیسر صاحب کو بہت پریشان کیا ہے۔ کم از کم لباس تو تبدیل کر لینے دیا ہوتا۔" وہ عیاری سے چہرے پر غصہ طاری کر کے ان پر چلّانے لگا اور ڈانٹ ڈپٹ کر سب کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد اس نے پروفیسر سے معذرت کی اور صوفے پر بیٹھنے کی درخواست کی۔

پروفیسر جلا بھنا سا جا کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس شخص نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ نرم لہجے میں بولا "پروفیسر صاحب میں نے دراصل آپ کو اس لیے اس وقت تکلیف دی کہ کل دس بجے دن کو مجھے سماجی بہبود کی کانفرنس کے ایک اجلاس کی صدارت کرنی ہے۔"

پروفیسر جھنجھلا کر بولا "تو پھر آپ نے کسی ڈاکٹر کو بلایا ہوتا، جو آپ کے لیے کوئی ایسی دوا تجویز کرتا کہ صدارت کرتے وقت آپ پر اعصاب زدگی کا دورہ نہ پڑے۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

اس نے پروفیسر کی بات کا ذرا بھی برا نہ مانا۔ مسکرا کر بولا "دراصل میرا کام آپ ہی سے ہے۔ مجھے ایک خطبۂ صدارت کی ضرورت ہے اور وہ آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔"

پروفیسر تھنا کر بولا "آپ نے خطبۂ صدارت لکھانے کا طریقہ بہت اچھا نکالا ہے۔"

وہ ڈھٹائی سے ہنستا رہا "بات یہ ہے، کانفرنس والوں نے آج ہی شام اطلاع دی ہے کہ کل کے اجلاس کی صدارت مجھے کرنی ہے۔"

پروفیسر نے اسی تیکھے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن اس وقت میں کوئی بھی ذہنی کام نہیں کر سکتا۔"

وہ بولا "میں آپ کو اس کا ہزار روپیہ معاوضہ دوں گا۔"

پروفیسر نے اسے گھور کر دیکھا۔ "میں اس قسم کی سودے بازی کرنے کا قائل نہیں ہوں۔"

"چلیے پندرہ سو لے لیجیے۔ دیکھیے اب انکار نہ کیجیے۔ پندرہ سو کی رقم کم نہیں ہوتی اتنے سے

کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کیا جاسکتا ہے۔ آپ وہ قیمتی کتابیں خرید سکتے ہیں جن کو لائبریری میں دیکھ کر اکثر چوری کرنے کی بھی نیت ہو جاتی ہے۔"

اس دفعہ پروفیسر کو اس کی باتیں زیادہ ناگوار نہ گزریں۔ اس کا انداز قطعی کاروباری تھا مگر اس میں ذہانت ضرور تھی۔ لیکن وہ اس کی بات پھر بھی قبول نہ کر سکا۔ کہنے لگا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی یہ پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔"

"دیکھئے میں آپ کو دو ہزار تک دے دوں گا، غور تو کیجئے۔ یہ خاصا بڑا آفر ہے۔ اتنے روپے سے آپ ایک سیکنڈ ہینڈ اسکوٹر خرید سکتے ہیں۔ کچھ رقم اپنے پاس سے ملا کر پرانے ماڈل کی کار بھی خرید سکتے ہیں اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ آج کل کار، زندگی میں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ کار موجود ہو تو بغیر سفارش کے بھی دفتروں میں کام چل جاتا ہے۔ لڑکیوں سے فلرٹ کرنے کے لیے۔"

اچانک اس کی نظر پروفیسر کی فرنچ کٹ سفید ڈاڑھی پر جا پہنچی۔ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔ پروفیسر کو وہ بھاری بھرکم بچر تب آدمی خاصہ دلچسپ معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ہر انکار پر معاوضہ کی رقم بڑھاتا جا رہا تھا۔ ہر پیش کش کے ساتھ وہ دولت کی اہمیت کا ایک نیا پہلو پیش کرتا۔ آخر رقم کی تعداد ساڑھے تین ہزار تک پہنچ گئی۔ اس مرتبہ وہ بولا۔

"ساڑھے تین ہزار میری آخری پیش کش ہے۔ اسے نہ قبول کرنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس رقم سے آپ ائیر فرانس کا سیزنل ٹکٹ خرید کر یورپ کی سیر کر سکتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے۔"

پروفیسر نے اس کی بات کاٹ دی "اچھا ہوا کہ آپ نے آخری پیش کش کا اظہار کر دیا۔ میں اپنا آخری جواب دینے سے پہلے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ اچھا نہ ہوگا کہ آپ کل کانفرنس کے اجلاس کی صدارت نہ کریں۔"

وہ بولا "ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ کانفرنس کے منتظمین کا فنڈ کم پڑ گیا تھا لہذا وہ مجھ سے بیس ہزار کا عطیہ لے گئے ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ یہ عطیہ دینے کے بعد صدارت مجھ پر فرض ہو گئی ہے۔"

پروفیسر کا انداز ذرا بھی تبدیل نہ ہوا "میں ایک بار نہیں، بار بار کہہ چکا کہ میں ہرگز ایسا کام نہیں کر سکتا۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہے، سمجھے آپ۔"

وہ بولا "لیکن میں بیس ہزار روپے کا نقصان بھی تو نہیں برداشت کر سکتا۔"

"مجھے آپ سے پوری پوری ہمدردی ہے۔"

ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد وہ شخص بولا "دیکھئے میں رقم میں مزید اضافہ نہیں کر سکتا میرا تخمینہ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا۔ کاروبار میں، میں تخمینہ کی اہمیت کا سختی سے قائل ہوں۔"

پروفیسر اس کی باتوں سے پہلے ہی کم حیرت زدہ نہیں تھا۔ یہ بات سن کر وہ اچھل پڑا "کانفرنس کی صدارت اور کاروبار سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ قطعی مہمل بات ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔"

وہ بے تکلفی سے مسکرا دیا "فی الحال میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ البتہ اگر کبھی وزیر بن گیا تو آپ کو یہ نکتہ سمجھا سکوں گا۔ اس وقت تو آپ خطبۂ صدارت لکھ دیجئے۔ یقین مانیے میں کسی اور کو بھی بلا سکتا تھا۔ مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ اس شہر میں آپ سے بہتر اور کوئی ایسا قابل آدمی نہیں جو اس موضوع پر خطبہ صدارت لکھ سکے۔"

پروفیسر جھٹ سے بولا "بالکل غلط، یہ ڈاکٹر نازش کی توہین ہے۔ وہ سماجی علوم کے ماہر ہیں۔ سوشیولوجی کے پروفیسر ہیں۔ میں تو انگریزی ادب پڑھاتا ہوں۔"

وہ کہنے لگا "یہ بات آپ نے پہلے کیوں نہ بتائی۔ اگر آپ تیار نہیں ہیں تو پھر میں انھی کو بلوائے لیتا ہوں۔"

پروفیسر چونک پڑا "نہیں آپ اس وقت اس معزز شخص کو پریشان کریں گے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ ابھی تک اپنی لائبریری میں بیٹھا مطالعہ میں غرق ہو اور آپ کے یہ اجڈ آدمی جا کر اسے گرفتار کر کے یہاں لے آئیں۔ بالکل میری طرح۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں ایسی بات سننا بھی نہیں چاہتا۔"

"کیا کیا جائے۔ آپ تیار نہیں ہوتے، مجبوراً انھی کو بلوانا پڑے گا۔"

پروفیسر اور ناراض ہو گیا "میں آپ پر حبس بے جا کا مقدمہ چلا دوں گا۔"

وہ کہنے لگا "آپ چاہیں تو اقدام قتل کا الزام بھی میرے خلاف عائد کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ آپ کل کریں گے۔ میرا کام آج ہونا چاہیئے۔ میں ابھی ڈاکٹر نازش کو بلواتا ہوں۔"

پروفیسر گھبرا گیا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا اور اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے سوچا یہ کتنا عبرت ناک منظر ہوگا۔ ڈاکٹر نازش کسی کتاب پر جھکا ہوا مطالعہ میں

محو ہو گا۔ اب تو رات آدھی کے قریب ہو گئی ہے۔ مطالعہ میں جو لذت ہے، جو لطف ہے وہ اس وقت اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ یہ کتنا ظلم ہو گا کہ ایسے عالم میں جب ڈاکٹر کسی خیال کو مکمل کرنے میں ڈوبا ہو، اچانک کھڑکی کے راستے تین دیو قامت انسان کود کر اندر داخل ہوں اور اسے زبردستی پکڑ کر اس آدمی کے پاس لے آئیں جو اپنے احمقانہ مشاغل کے لئے شریف شہریوں کو اس طرح پریشان کرتا ہے۔ اس نے گھور کر اس شخص کو دیکھا اور زچ ہو کر بولا۔

"چلیے میں تیار ہوں۔ آپ کی کوٹھی میں کوئی ایسا بھی کمرہ ہے جہاں میں یکسوئی سے بیٹھ کر لکھ سکوں"
وہ کہنے لگا: "آپ لائبریری میں چلیے۔ لکھنے پڑھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ اور کونسی ہو سکتی ہے؟"

پروفیسر چپ چاپ اس کے ہمراہ لائبریری میں چلا گیا۔ یہاں خوب صورت الماریوں میں کتنی ہی قیمتی اور نایاب کتابیں قرینے سے سجی تھیں۔ ان میں بعض تو ایسی کتابیں تھیں جن کی تلاش میں وہ مہینوں سرگرداں رہا تھا۔ یہ بات بھی اُسے سخت ناگوار گزری۔ کسی ایسے جاہل اور نامعقول شخص کے پاس ایسی نادر کتابوں کا ہونا، علم و ادب کی توہین ہے۔

وہ کچھ الٹے سیدھے پوائنٹ بتا کر لائبریری سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پروفیسر نے کاغذ لیا اور انتہائی جھنجھلاہٹ کے عالم میں لکھنا شروع کر دیا۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ لکھے ہوئے کاغذات چیر پھاڑ کر بھاگ جائے۔ زور زور سے چلّانے لگے۔ کبھی وہ بے چینی سے اٹھ کر خارش زدہ کتے کی طرح لائبریری میں چکر کاٹنے لگتا۔ دیر تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ لیکن جب وہ اسے مکمل کر چکا تو کسی قدر مطمئن تھا۔ اس نے خطبۂ صدارت کو مہمل بنانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ایسے ایسے فلسفیوں کے نام لکھے تھے۔ جن کی ابھی مائیں بھی پیدا نہیں ہوئی تھیں جن کی کوکھ سے وہ جنم لیتے۔ ایسے ایسے دلچسپ انکشافات کئے تھے۔ ایسی ایسی عجیب و غریب اصطلاحات تھیں، جنھیں پڑھ کر وہ خود بھی مسکرانے لگا۔ بلکہ ایک بار تو اسے بے ساختہ ہنسی آگئی اور وہ دیر تک ہنستا رہا۔

جب وہ لائبریری سے باہر نکلا تو رات ڈھل چکی تھی۔ کوٹھی پر گہرا سنّاٹا طاری تھا مگر سماجی بہبود کی کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کرنے والا ابھی تک جاگ رہا تھا۔ اس نے کاغذات سنبھالے اور پروفیسر کو اسی وقت اس کے گھر کار میں بھجوا دیا۔

رات بھر جاگنے کے باعث پروفیسر کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں اور جسم ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے غسل کیا اور فوراً بستر پہ جا کر سو گیا۔

اس روز خلافِ معمول وہ دن بھر سوتا رہا۔ رات کو بھی وہ جلد ہی سو گیا۔ صبح اٹھ کر اس نے گرم، گرم چائے کی ایک پیالی پی۔ مگر ابھی تک اس کی طبیعت میں کسل مندی تھی۔ پچھلی رات کو نہ وہ چہل قدمی کے لئے گھر سے باہر نکل سکا تھا نہ مطالعہ کر سکا تھا۔ اپنے معمولات میں اتنی بڑی تبدیلی پہ اسے غصہ بھی آیا۔ مگر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ اس نے اپنی ہر ذہنی تکلیف کا انتقام لے لیا تھا۔ اب اسے اخبار کا انتظار تھا جس میں وہ کانفرنس کے اجلاس کی کارروائی دیکھنا چاہتا تھا جہاں وہ خطبہ پڑھا گیا ہو گا، جسے اس نے لغو اور بے سر و پا بنانے کی پوری، پوری کوشش کی تھی۔ اس نے سوچا کتنا اچھا ہوتا کہ وہ خود اس اجتماع میں موجود ہوتا اور اپنی آنکھوں سے دیکھتا کہ صدر نے خطبۂ صدارت شروع کیا۔ پہلے حاضرین چونکے۔ پھر حیرت زدہ ہوئے۔ رفتہ رفتہ سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ لوگوں کے چہرے مسکرانے لگے۔ پھر ایک ایک جملہ پر قہقہوں کی بارش، صدر کی بدحواسی، اس کا بار بار رومال سے پسینہ پونچھنا واقعی یہ ایک پرلطف نظارہ ہوتا۔ وہ خاموش بیٹھا ان تصورات سے لطف اٹھاتا رہا۔

اخبار آتے ہی اس نے سب سے پہلے کانفرنس کی خبر تلاش کی۔ اسے زیادہ دقّت نہ ہوئی۔ پہلے ہی صفحہ پر اسے نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا۔ لیکن چند ہی جملے پڑھے ہوں گے کہ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ لکھا تھا۔

"آج کا اجلاس بے حد کامیاب رہا۔ حاضرین نے جناب صدر کے خیال انگیز اور بصیرت افروز خطبۂ صدارت کو پوری توجہ سے سنا۔ بار، بار تالیاں بجا کر خراج تحسین پیش کیا۔

وہ آگے نہ پڑھ سکا۔ جھنجھلا کر اخبار ایک طرف پھینکا اور جلدی جلدی کتابوں کی الماریوں میں سے اپنی ساری لغات اور فرہنگ نکالیں اور لفظ "خیال انگیز" اور "بصیرت افروز" کے معنی تلاش کرنے لگا۔ مگر ہر لغت میں، ہر فرہنگ میں وہی معنی درج تھے جو اس کے ذہن میں تھے۔ کوئی نئے معنی وہ تلاش بسیار کے باوجود نہ دیکھ سکا۔

اس نے اخبار اٹھا کر آگے پڑھا۔ ہر ہر جملہ خطبۂ صدارت کی علمیت اور فضیلت کی تعریف میں تھا۔ پروفیسر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جھنجھلا کر اخبار کے ٹکڑے، ٹکڑے کر ڈالے اور بادل سے

کتے کی طرح کمرے میں چکّر کاٹنے لگا۔ مگر اس کی بے قراری کم نہ ہوئی۔ آخر وہ فرش پر سر کے بل کھڑا ہو گیا۔ جب اس کا دماغ بوجھل اور پراگندہ ہوتا تو وہ یہی نسخہ آزماتا تھا۔ مگر آج اس سے بھی کام نہ چل سکا۔ منٹ بھر بھی وہ اس طرح یوگ کا آسن جمائے کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے اٹھ کر کئی گلاس پانی کے پیئے اور پریشانی کے عالم میں گھر سے باہر نکل گیا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہمراہ ایک موٹا تازہ گدھا تھا۔ محلّے والے حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ مگر وہ سب سے بے نیاز گدھے کو چمکارتا ہوا گھر کے اندر لے آیا اور سیدھا مطالعے کے کمرے میں گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا۔ گدھے کو جھک کر سلام کیا اور مؤدب ہو کر گویا ہوا۔

"قبلہ عالم! میں آج سے آپ کی شاگردی قبول کرتا ہوں۔ عمرِ عزیز کے ۵۶ سال جو گمراہی اور کم فہمی میں گزرے ان کا مجھے مطلق افسوس نہیں۔ استادِ محترم! افسوس صرف اس بات کا ہے کہ میں نے آج تک آپ کی ذات والا صفات کو کیوں نہیں پہچانا!"

یہ کہتے کہتے پروفیسر جوشِ عقیدت میں گدھے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ خاموش کھڑے کھڑے گدھے کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس زور سے دولتی جھاڑی کہ پروفیسر کا جبڑا اکھڑ گیا۔ کئی دانت نکل کر باہر گر پڑے۔

پروفیسر آج کل اسپتال میں ہے۔ وہ ہر وقت نہ معلوم کیسی اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے!

خان بہادر

لائبریری سے پہلے کشادہ اور طویل گیلری تھی جس کی دیواروں پر ہالہ کے ماہر کاشی گروں کے بنائے ہوئے ٹائیل لگے تھے۔ روشنی کے لئے بلوری دیوارگیریاں تھیں اور چھت سے دو خوبصورت فانوس لٹک رہے تھے۔ رات کو دیوارگیریوں اور فانوسوں میں کافوری شمعیں روشن کردی جاتیں تو گیلری کے در و دیوار جھلملاتی روشنیوں سے جگمگانے لگتے۔

گیلری میں سرخ ایرانی قالین کا فرش تھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ خوبصورت طغرے اور مغلیہ فن مصوری کے اعلیٰ نمونے آویزاں تھے۔ ایک سلسلے سے مہاگنی اور ٹیک کی الماریاں رکھی تھیں۔ ان کے اونچے اونچے صاف شفاف دروازے شیشے کے تھے اور ہر دروازہ مقفّل تھا۔ الماریوں کے اندر پرانی ساخت کی بندوقیں اور قرابین، مختلف وضع کی ڈھال اور تلواریں، چاندی اور پیتل کے شمع دان، چینی کے نفیس ظروف، کانسی اور پتھر کے چھوٹے بڑے مجسمے اور ایسی ہی دوسری نادر اشیاء موجود تھیں۔ ان نوادر کو اس سلیقے سے بنا سنوار کر رکھا گیا تھا کہ خوش ذوقی صاف جھلکتی تھی۔

سورج اب مغربی افق میں اتر گیا تھا۔ مگر ابھی پہر دن رہتا تھا۔ گیلری میں روشنی اب کم ہوگئی تھی۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ ایک بوڑھے ملازم نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور مؤدّب ہو کر ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ خان بہادر عبدالباری نے ہاتھ اٹھا کر اپنے معزز مہمان پیٹر والفورڈ سے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ والفورڈ ٹھٹکا، مسکرا کر خان بہادر کی جانب دیکھا اور پھر خاموشی سے گیلری میں داخل ہوگیا۔ خان بہادر کا پرائیوٹ سکریٹری دلشاد احمد پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

والفورڈ نے نظریں گھما پھرا کر گیلری کو دیکھا۔ بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا "بہت شاندار

خوشی سے خان بہادر کی باچھیں کھل گئیں۔

والفورڈ ہر الماری کے پاس جاتا۔ جھک کر ایک ایک چیز انہماک اور توجّہ سے دیکھتا۔ ان کے بارے میں کرید کرید کر پوچھتا۔ خان بہادر بڑی مستعدی سے منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی میں ایک ایک تفصیل بتاتا۔ بار بار کف افسوس مل کر کہتا۔

"افسوس کہ تقسیم سے قبل آپ سے ملاقات نہ ہوئی۔ اگر ہندوستان میں ملتے تو میں آپ کو اپنی آرٹ گیلری دکھاتا۔ میرے پاس نوادرات کا ایسا بے مثل ذخیرہ تھا کہ باذوق لوگ دُور دور سے اسے دیکھنے آتے تھے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں۔"

"مگر یہاں جو کچھ ہے کم نہیں۔ بہت اہم اور دلچسپ ہے۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا۔"

"کچھ تو میں کسی نہ کسی طور اپنے ساتھ لے آیا۔ کچھ یہاں خرید کر اکٹھا کئے ہیں۔" خان بہادر وضاحت کرتا۔ اسے مرعوب کرنے کے لئے بتاتا "مجھے نوادرات سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ ہر چیز منہ مانگی قیمت دے کر خریدی ہے۔ یہ بھی سمجھئے غنیمت ہے۔ بمبئی میں ایک ہندو شرنارتھی مل گیا تھا۔ اس سے جائیداد کا تبادلہ کرلیا تو اتنا بھی ٹھکانا ہوگیا۔ متروکہ جائیداد کے الاٹمنٹ کے چکّر میں پڑتا تو سرکاری دفتروں کے طواف کرتے کرتے جوتے گھس جاتے۔ ایسی موقع کی جائیداد اور زمین داری نہ ملتی۔ ویسے ہندوستان میں اتنی بڑی املاک اور اراضی چھوڑ کر آیا ہوں کہ اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں۔"

ایسے موقع پر وہ ہمیشہ سخن سازی سے کام لیتا تھا اور یہ جھوٹ اتنی بار بول چکا تھا کہ اب تو اس کے اظہار میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ ہوتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنی جائیداد پہلے ہی ٹھکانے لگا چکا تھا۔ کچھ تو رہن تھی اور قرق ہو کر مہاجنوں کے قبضے میں جا چکی تھی۔ جو باقی رہ گئی وہ اس نے چھوٹے بھائی کے نام منتقل کردی تھی۔ مگر اس کی دستاویزات کی نقلیں وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ ان میں وہ زرعی اراضی بھی شامل تھی جو زمین داری کے خاتمے کے قانون کے ساتھ ختم ہوگئی تھی اور اس کے عوض میں بانڈ مل گئے تھے۔ اس نے بانڈ بھی اَونے پونے فروخت کردیئے تھے۔ اس کے پاس جو دستاویزات تھیں ان میں ایسی بھی تھیں جو اس نے ایک ایسے شخص سے تیار کرائی تھیں جو جعلی دستاویزات تیار کرنے میں ماہر تھا۔ وہ اس صفائی سے مطلوبہ دستاویز بناتا تھا کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ اتنی

دستاویزات کی بنیاد پر اس نے اتنی بڑی متروکہ جائیداد اپنے نام الاٹ کرالی تھی۔

☆

والفورڈ توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ بیچ بیچ میں وہ کوئی مختصر سوال بھی کرلیتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خان بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔

چلتے چلتے وہ ایک الماری کے سامنے پہنچ کر ٹھٹکا۔ صاف شفاف شیشے کے پیچھے ایک لمبی تلوار ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کا دستہ چاندی کا تھا اور اس پر طلائی نقش و نگار نہایت نفاست سے کندہ کئے گئے تھے۔ مگر دستہ جس قدر خوبصورت تھا تلوار اسی قدر بھدی تھی۔ اس پر جگہ جگہ سیاہ دھبے اس طرح نمایاں تھے کہ انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہیں صاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ والفورڈ نے مڑ کر خان بہادر کی جانب دیکھا اور تلوار کی سمت اشارہ کرکے اپنے تجسّس کا اظہار کیا۔

"خان بہادر! اس تلوار پر یہ دھبّے کیسے ہیں؟"

خان بہادر عبدالباری نے آگے بڑھ کر تلوار کو دیکھا اور مسکرا کر بولا: "جی یہ خون کے دھبّے ہیں۔"

"خون کے دھبّے ہیں؟" والفورڈ نے حیرت زدہ ہوکر دریافت کیا۔

"بالکل خون کے دھبّے ہیں۔" خان بہادر نے فخر سے سینہ تان کر مطلع کیا: "اس تلوار سے میرے دادا نے ۱۸۵۷ء کے غدر میں بارہ سو سے زائد باغیوں کو ہلاک کیا تھا۔"

"واقعی! بارہ سو سے زائد باغیوں کو قتل کیا تھا؟" والفورڈ نے آنکھیں پھاڑ کر یقین نہ آنے کے انداز میں اپنے ردّ عمل کا اظہار کیا۔

"بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔" خان بہادر کا سینہ اور تن گیا: "میرے دادا مرحوم نواب عبداللہ خاں غضب کے جری اور بے مثل شمشیرزن تھے ان کی بہادری اور شمشیر زنی کے نہ جانے کتنے قصے مشہور ہیں۔ عالم ان کا یہ تھا کہ شیر کا شکار ہمیشہ تلوار سے کیا اور تن تنہا کیا۔ نہ کبھی بندوق استعمال کی اور نہ مچان پر شکار کی گھات میں بیٹھے۔" اس کے لہجے میں اور طنطنہ پیدا ہوگیا: "میدان جنگ میں ہمیشہ دشمن کو للکار کر حملہ کرتے تھے۔ کبھی غافل پاکر وار نہیں کیا۔ یہ بارہ سو باغی بھی انھوں نے میدان جنگ میں اپنی شمشیر زنی کے جوہر دکھا کر تنہا قتل کئے تھے۔"

والفورڈ کو اس کے دعوے پر یقین تو نہ آیا مگر وہ اس کی کسی بات کی نفی نہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خان بہادر کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا: "میں نے ہندوستانی غدر کے بارے میں ایک کتاب پڑھی تھی۔ یاد آتا ہے اس میں اس واقعے کا بھی ذکر تھا۔"

"اس کتاب کا نام کیا تھا؟" خان بہادر نے بے قرار ہوکر فوراً پوچھا: "میری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری۔ میں اسے خرید کر اپنی لائبریری میں رکھنا چاہتا ہوں۔"

"پرانی بات ہے۔ اس وقت مجھے اس کا نام یاد نہیں آرہا۔" والفورڈ نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی اس نے خان بہادر کو اطمینان بھی دلایا: "میں واپس لندن جاکر اسے حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو بھجوادوں گا۔"

والفورڈ کی اس چرب زبانی پر خان بہادر کے نوجوان سیکرٹری نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔ لیکن خان بہادر کی گردن اونچی ہوگئی۔ سینہ کچھ اور تن گیا۔ اس نے نہایت طمطراق سے کہا: "اس واقعے کا ذکر آپ نے ضرور پڑھا ہوگا۔ یہ تو غدر کا بہت مشہور واقعہ ہے۔ میری لائبریری میں کئی ایسے مخطوطات ہیں جن میں اس واقعے کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن سب فارسی میں ہیں۔" اس نے قدرے تامل کے بعد پوچھا: "کیا آپ فارسی جانتے ہیں؟"

"میں بدقسمتی سے فارسی نہیں جانتا۔ لیکن یہ ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ اتنا حیرت انگیز کارنامہ آپ کے دادا نے کس طرح انجام دیا؟"

"یہ واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ جس وقت برطانوی فوج کی ہندوستانی پلٹنوں میں بغاوت پھیلی تب میرے دادا قلعہ چاندگڑھ کے قلعہ دار تھے۔" خان بہادر نے بڑے فخر سے والفورڈ کو بتایا۔ "باغی سپاہی میرٹھ سے نکل کر قتل و غارت گری کرتے ہوئے دہلی کی سمت بڑھے تو گرد و نواح کے علاقوں کے انگریزوں نے قلعہ چاندگڑھ میں آکر پناہ لی۔ میرے دادا نے انھیں تحفّظ کا یقین دلایا۔ وہ خود کو محفوظ بھی سمجھنے لگے۔ ویسے چاندگڑھ بڑا مضبوط قلعہ تھا۔ مگر جب باغی فوج کا ایک دستہ چاندگڑھ کی جانب بڑھا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکام کو پناہ گزیں انگریزوں کی فکر لاحق ہوئی۔"

"فکر کی بات ہی تھی۔ باغی بڑے سفّاک اور بے رحم تھے۔" والفورڈ نے اپنے فوری ردّ عمل کا اظہار کیا: "انھوں نے تو عورتوں اور بچوں پر بھی ذرا رحم نہ کھایا۔ بلا امتیاز سب کو تہہ تیغ کردیا۔"

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔ باغی اسی قدر خونخوار اور وحشی تھے" خان بہادر عبدالباری نے اس کی تائید کی "دادا مرحوم کو ایک پیغام رساں کے ذریعے جب انگریز حکام کی تشویش کا علم ہوا تو انھوں نے اسی پیغام رساں کو ایک خط دے کر فوراً واپس بھیجا۔ اس خط میں انھوں نے کمپنی بہادر کی حکومت سے اپنی وفاداری کے عہد کے ساتھ ساتھ یہ یقین دلایا تھا کہ باغی ان کی لاش پر سے گزر کر ہی قلعے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ جب تک ان کی گردن پر سر ہے کسی انگریز پناہ گزین پر ذرا بھی آنچ نہیں آ سکتی۔ انھوں نے جیسا کہا تھا وہی کیا۔"

"کیا کیا انھوں نے؟"

"انھوں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ باغیوں کو خبردار کیا کہ قلعہ چاند گڑھ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو منہ کی کھانی پڑے گی" خان بہادر عبدالباری نے پیٹر والفورڈ کو مطلع کیا "مگر باغی باز نہ آئے۔ برابر آگے بڑھتے رہے اور قلعے کے سامنے پہنچ کر حملہ کرنے کے لئے صف آرا ہو گئے۔ لیکن ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے میرے دادا نے خود قلعے سے نکل کر حملہ کیا۔ ایسی بہادری سے لڑے کہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ کچھ تو ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جو باقی رہ گئے ان کی تعداد بارہ سو سے اوپر تھی۔ دادا مرحوم اس قدر غیظ و غضب کے عالم میں تھے کہ ایک ایک باغی کو چن چن کر قتل کر دیا" اس کی آواز میں بجلی کی سی کڑک پیدا ہو گئی "اس وقت ان کے ہاتھ میں یہی تلوار تھی اور اس پر جو خون لگا ہے وہ انھی مقتول باغی فوجیوں کا ہے۔ یہ بڑی یادگار تلوار ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ خان بہادر عبدالباری کے دادا، قلعہ دار عبداللہ خاں، نے اس مرصّع دستے والی تلوار سے بارہ سو سے زیادہ باغی فوجیوں کو ۱۸۵۷ء میں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ لیکن روایت کچھ اس طرح ہے کہ باغیوں نے جب قلعہ چاند گڑھ کا محاصرہ کیا تو قلعہ دار عبداللہ خاں نے انھیں اپنی حمایت کا یقین دلایا اور قلعے میں موجود انگریزوں کو ان کی تحویل میں دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن قلعے کا دروازہ کھولنے سے پہلے انھیں حیلے بہانے سے باہر ہی ٹھہرائے رکھا۔ ان کے لئے قلعے سے انواع و اقسام کے عمدہ اور لذیذ کھانوں کے خوان بھیجے۔ ان میں عبداللہ خاں نے زہر ملوا دیا۔ یہ سازش اس نے اس قدر ہوشیاری سے تیار کی تھی کہ باغیوں کو ذرا شبہ نہ ہوا۔ انھوں نے اس کھانے کو بہت رغبت سے کھایا۔ زہر اس قدر زود اثر تھا کہ کھانا کھانے کے بعد کوئی بھی

زندہ نہ بچا۔ جب وہ موت کی نیند سو گئے تو اپنی بہادری کا سکہ بٹھانے کے لئے عبداللہ خاں نے رات کی تاریکی میں تلوار سے لاشوں کے ٹکڑے کر دیئے۔

☆

والفورڈ الماری کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ خان بہادر الماری کے اندر رکھی ہوئی خون آلود تلوار کے بارے میں گردن اکڑا کر اور منہ ٹیڑھا کر کے بتاتا رہا "آخر جب باغیوں کو ہر محاذ پر شکست ہوئی۔ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور ہر طرف امن و اماں قائم ہوا تو یہ شاندار کارنامہ انجام دینے پر میرے دادا کو خلعت اور بہت بڑی جاگیر عطا ہوئی۔ اس وقت سے یہ تلوار ہمارے خاندان میں ایک بیش بہا ورثے کے طور پر محفوظ ہے۔"

اس دفعہ والفورڈ واقعی اس کی باتوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اظہار عقیدت کے طور پر خون آلود تلوار کے سامنے سر جھکا دیا۔

دونوں آگے بڑھے۔ والفورڈ ہر الماری کے سامنے ٹھہرتا اور اس میں رکھے ہوئے نوادر کو دلچسپی اور توجّہ سے دیکھتا۔ خان بہادر نے اسے طرح طرح کے وہ طلائی اور نقرئی تمغے دکھائے جو اسے اور اس کے بزرگوں کو تاج برطانیہ کی وفاداری اور خیر خواہی میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے صلے میں دیئے گئے تھے۔ تمغوں کے علاوہ کتنی ہی ایسی اسناد اور دستاویز بھی شیشوں کے پیچھے خوبصورت سنہری فریموں میں آویزاں تھیں جو انگریز حکام کی طرف سے ملی تھیں۔

خان بہادر عبدالباری ہر تمغے اور ہر سند کے متعلق تفصیل سے والفورڈ کو مطلع کرتا رہا۔ والفورڈ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اب کچھ اکتایا ہوا اور تھکا تھکا نظر آ رہا تھا۔ مگر ایک الماری کے سامنے پہنچ کر وہ چونکا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھا، مخمل کے ایک چمک دار اور نرم نرم پارچے پر پرانی وضع کا ایک جوتا نہایت اہتمام سے رکھا تھا۔ چمڑا سوکھ کر اس طرح سکڑ گیا تھا کہ جوتا ٹیڑھا میڑھا ہو گیا تھا۔

والفورڈ نے دریافت کیا "خان بہادر! یہ جوتا ہی ہے یا کچھ اور؟" اس کے لہجے سے استعجاب آشکارہ تھا

"ہے تو یہ جوتا ہی مگر یہ بہت بڑی خاندانی امانت ہے" خان بہادر نے مسکین سی

صورت بنا کر بتایا۔ "دراصل اس جوتے کے ساتھ ہمارے خاندان کی خوشحالی اور عظمت کی ایک دلچسپ داستان وابستہ ہے۔"

"کیا آپ اس کے بارے میں تفصیل سے کچھ بتانا پسند کریں گے؟" والفورڈ نے نرم اور شگفتہ لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ "اسے معلوم کر کے مجھے خوشی ہوگی۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ میرے دادا نے بہت عیش و عشرت کی زندگی بسر کی۔ طرح طرح کے رئیسانہ مشاغل اور تفریحات پر بے دریغ خرچ کرنے کے ساتھ ساتھ فیاض بھی بہت تھے۔ ان کی کئی بیگمات تھیں اور ان سے بائیس اولادیں تھیں۔ ان کی بیشتر جائیداد اور جاگیر فضول خرچی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ انتقال کے بعد انھوں نے جو جائیداد چھوڑی وہ بائیس اولادوں میں اس طرح تقسیم ہوئی کہ میرے والد کو ترکے میں جو کچھ ملا اس سے عزت کے ساتھ گزر بسر کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ سخت پریشاں حالی اور تنگ دستی میں مبتلا تھے۔ مگر اس جوتے نے دست گیری کی۔ اس طرح سہارا دیا کہ ان کے دن پھر گئے۔ امراء اور رئیسوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ لاٹ گورنر کے دربار میں انکو کرسی ملتی۔" خان بہادر اپنی بات کہتے کہتے کھل کر مسکرایا۔ "آج میرے پاس جو جائیداد اور جاگیر ہے وہ اسی جوتے کی کرامات ہے۔ اسے تو میں اپنی خاندانی وفاداری کے ثبوت میں انگریز حکام کے سامنے بطور خاص پیش کرتا تھا۔ سچ پوچھیئے تو خان بہادر کا خطاب بھی مجھے اسی جوتے کے طفیل ملا تھا۔ یہ خطاب مجھے اس قدر عزیز ہے کہ مسلم لیگ کا عہدیدار ہونیکے باوجود اسے اب تک چھوڑ نہیں سکا۔"

والفورڈ اور بھی چکرایا۔ بھلا یہ ٹیڑھا میڑھا سوکھا سڑا جوتا کسی کی کس طرح دست گیری کر سکتا ہے۔ تنگ دستی اور ابتلا کے شکنجے سے نکلنے میں سہارا دے سکتا ہے؟ لیکن اس نے اپنی ذہنی کشمکش کا اظہار نہ کیا۔ خاموش کھڑا جوتے کو تکتا رہا۔ اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ سے خان بہادر فوراً بھانپ گیا کہ وہ کسی الجھن میں مبتلا ہے۔ اس نے برملا اس کا اظہار بھی کر دیا۔

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کس الجھن میں مبتلا ہیں۔" اس نے کھنکار کر والفورڈ کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ "میں آپ کو زیادہ دیر اس الجھن میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ کیوں نہ آپ کو کھل کر سب کچھ بتا دوں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ آپ کی قوم کے ساتھ میری وفاداری اور وابستگی کتنی پختہ اور دیرینہ ہے۔ یہ آئندہ ہمارے کاروباری تعلقات میں بھی معاون و مددگار ثابت

ہوگی۔ باہمی اعتماد مستحکم ہوگا۔"

"یقیناً، یقیناً۔" والفورڈ نے مسکرا کر تائید کی۔ "میں اسے بہت دلچسپی سے سننا چاہوں گا۔"

"ہوا یہ کہ جب والد مرحوم بہت پریشان ہو گئے تو انھوں نے انگریز حکام سے رجوع کرنے کی ٹھانی۔ انھی دنوں ایک نیا کمشنر علاقے میں تعینات ہوا، وہ بڑا دبنگ افسر تھا۔ نہایت اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ فرائض منصبی کی ادائیگی دیانت داری سے کرتا تھا۔ اس کا کچھ تعلق شاہی خاندان سے بھی تھا۔ چنانچہ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد جب وہ واپس انگلستان گیا تو عمدہ کارکردگی اور گراں قدر خدمات کے صلے میں اسے نہ صرف سَر کا خطاب ملا بلکہ ہاؤس آف لارڈز کا ممبر بھی بنایا گیا۔" خان بہادر سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ "والد مرحوم نے اس سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر رسائی حاصل نہ ہوئی۔ آخر انھوں نے اس زمانے کے جہاں دیدہ درباریوں کا آزمودہ نسخہ استعمال کیا۔"

"وہ کیا تھا؟" والفورڈ نے بے چین ہو کر مداخلت کی۔

"والد مرحوم نے کمشنر کے ایک منہ چڑھے خانساماں سے مراسم پیدا کئے۔ اس سے اپنا مدعا بیان کیا۔ دس روپے کا ایک نوٹ بخشش کے طور پر دیا۔ روپے پا کر وہ ایسا خوش ہوا کہ ان کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے مشورے پر والد مرحوم نے کمشنر کو ڈالی پیش کی۔ اس میں قیمتی شرابیں تھیں، خشک میوے تھے، تازہ پھل تھے، کیک تھا، طرح طرح کی دیسی اور ولایتی مٹھائیاں تھیں اور ایسی ہی دوسری اشیا تھیں جو ڈالی میں شامل ہوتی ہیں۔ اتفاق سے کرسمس قریب تھا۔ ڈالی پیش کرنے کا نہایت مناسب جواز بھی تھا۔ ویسے ڈالی کسی بھی وقت پیش کی جا سکتی تھی مگر کرسمس کے موقع پر ڈالی پیش کرنے کا عام دستور تھا۔ اسے چمکدار پنی اور رنگ برنگی خوش نما کاغذوں سے اس طرح سجایا جاتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب نظر آئے۔"

"اس کے بارے میں کچھ میں نے بھی سنا ہے۔" والفورڈ نے ایک بار پھر اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔ "اب یہ بتائیے۔ بعد میں کیا ہوا؟"

"خانساماں نے اس طرح ملاقات کی سبیل پیدا کی۔" خان بہادر نے والفورڈ کو بتایا۔ "شام کا وقت ملاقات کے لئے مقرر ہوا۔ والد مرحوم نے وہ تمام تمغے اور سرٹیفکیٹ ایک بڑے ریشمی رومال میں لپیٹے جو ان کے بزرگوں کو وقتاً فوقتاً انگریز حکام کی جانب سے عطا کئے گئے تھے۔ اس

کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک درخواست تیار کی جس میں حکومت انگلستان کے ساتھ اپنی خاندانی وفاداری اور اعلیٰ خدمات بیان کی گئی تھیں۔ آخر میں اپنی پریشاں حالی کا اظہار کرتے ہوئے اعانت کی اپیل کی گئی تھی۔" خان بہادر نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "کمشنر اس وقت کمرے میں تنہا تھا اور اسکاچ سے شغل کر رہا تھا۔ والد مرحوم اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جھک کر آداب کیا۔ رومال کھول کر درخواست نکالی اور درخواست کے ساتھ تمغوں اور سرٹیفکیٹوں کو بھی کمشنر کے سامنے پیش کر دیا۔ اس نے درخواست پڑھی۔ سرٹیفکیٹ الٹ پلٹ کر دیکھے۔ تمغوں کا بھی جائزہ لیا۔ پھر والد مرحوم سے پوچھا کیا چاہتے ہو؟ وہ ہاتھ باندھے، نظریں جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ اس نے اصرار کیا۔ بار بار دریافت کیا۔ مگر کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ میرے والد کا منہ نہ کھلا۔ وہ جھنجھلا کر چیخنے لگا۔ وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ کمشنر اس وقت نشے میں دھت ہو رہا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ تلملا کر اٹھا۔ والد مرحوم کے قریب گیا اور ان کی کمر پر اس زور زور سے ٹھوکریں ماریں کہ وہ لڑکھڑا کر فرش پر منہ کے بل گرے۔"

"نہایت بے ہودہ اور بدتمیز شخص تھا۔" والفورڈ نے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

"تھا تو بہت بدتمیز اور مغلوب الغضب مگر دل کا برا نہیں تھا۔" خان بہادر نے والفورڈ سے اتفاق رائے نہ کیا۔ "ٹھوکریں مارنے کے بعد وہ واپس جا کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ والد مرحوم نہ چیخے نہ چلائے اور نہ کسی برہمی کا اظہار کیا۔ خاموشی سے اٹھے۔ کپڑوں سے خاک جھاڑی اور سر جھکا کر خاموش کھڑے ہو گئے۔ کمشنر کچھ دیر تو چپ بیٹھا رہا۔ گلاس اٹھا کر اسکاچ کے گھونٹ بھرتا رہا۔ پھر اسے خود ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے والد مرحوم سے پوچھا۔ ول عیدل! ہم نے کتنی ٹھوکریں تم کو ماریں؟ والد مرحوم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ حضور! ۶ ٹھوکریں تو مجھے یاد ہیں۔ آگے آپ کو خبر ہو گی۔ اس نے ہنس کر کہا۔ جاؤ تم کو ۶ گاؤں بخش دیئے۔"

"چھ گاؤں دے دیئے۔" والفورڈ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "اتنی بڑی جاگیر! وہ ان کو مل گئی تھی؟"

"جی ہاں، پورے ۶ گاؤں۔" خان بہادر نے اپنی بات پر زور دے کر بتایا۔ "کمشنر نے اسی وقت حکم جاری کر دیا تھا۔ اس زمانے میں انگریز حکام کو بے پناہ اختیارات حاصل تھے۔

ان کا حکم ہی قانون تھا۔ اپنی مرضی کے مالک تھے۔"

"مگر یہ جوتا؟" والفورڈ نے الماری میں رکھے ہوئے بدوضع جوتے کی جانب اشارہ کیا۔ "میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"میرے والد نے ایک بار پھر جھک کر کمشنر کو آداب کیا۔ جان و مال کی سلامتی کی دعائیں دیں اور ہاتھ باندھ کر اس کے روبرو مودب کھڑے رہے۔ کمشنر نے پوچھا۔ ول عیدل! اب تم کیا چاہتے ہو؟ اوہ، معاف کیجیے۔ میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ میرے والد کا نام عبدالرحمان تھا۔ انھوں نے کمشنر کی بات سن کر نہایت ادب سے کہا، سرکار! یہ جوتا مجھے عنایت کر دیا جائے۔ بڑی نوازش ہو گی۔ میں اسے ایک قیمتی یادگار کے طور اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ ان کی یہ بات سن کر اس نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس قدر خوش ہوا کہ دو گاؤں جاگیر میں اور بڑھا دیئے۔ یہ جوتا پیر سے اتارا اور والد مرحوم کو دے دیا۔"

عین اس وقت خان بہادر عبدالباری نے اپنی پشت پر لمبی سانس بھرنے کی سرسراہٹ محسوس کی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ نوجوان پرائیویٹ سیکرٹری خاموشی سے مڑا۔ خان بہادر نے اسے ٹوکا۔

"دیکھو یہ جوتا کس قدر خراب حالت میں ہے۔" اس نے شیشے کے پیچھے رکھے ہوئے جوتے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدت سے اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ اسے نکال کر کسی ملازم کو دو کہ وہ جھاڑ پونچھ کر پالش کر دے۔"

پرائیویٹ سیکرٹری نے مستعدی سے اسے یقین دلایا۔ "سر! جیسا آپ نے حکم دیا ہے ویسا ہی ہو گا۔" وہ آگے بڑھا اور گیلری سے باہر چلا گیا۔

خان بہادر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد والفورڈ کی جانب متوجہ ہوا۔ "میرے والد نے انتقال سے قبل یہ وصیت کی تھی کہ اس جوتے کو ایک قیمتی اثاثے کے طور پر بہت حفاظت سے رکھا جائے اور جب کوئی انگریز افسر تمہارے گھر آئے تو اسے یہ جوتا ضرور دکھانا اور اس کا پس منظر بھی بتانا۔ یہ انگریزوں کے ساتھ ہماری وفاداری کی یادگار ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "مگر اب نہ انگریزوں کی حکومت رہی نہ انگریز افسر رہے۔ آپ یہاں آئے تو عرصہ دراز بعد

مجھے اس کے بارے میں کچھ بتانے کا موقع ملا۔"

والفورڈ خاموش رہا۔ خان بہادر بڑھ کر دوسری الماری کے پاس پہنچا۔ والفورڈ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے استفسار پر خان بہادر الماریوں میں رکھے ہوئے نوادر کے متعلق بتاتا رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے۔

☆

گیلری سے نکل کر دونوں لائبریری میں پہنچے۔ لائبریری جس کمرے میں تھی وہ زیادہ وسیع نہ تھا۔ اس کمرے میں بھی الماریاں تھیں اور الماریوں کے اندر سلیقے سے کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ ان میں بعض قلمی نسخے بھی تھے۔ کتابوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مدت سے الماریوں کو کھولا بھی نہیں گیا۔

لائبریری کی چھت سے ایک خوبصورت بلّوری جھاڑ لٹک رہا تھا۔ قالین کا فرش تھا۔ وسط میں چمکتی دمکتی خوش نما میز تھی۔ ایک گوشے میں صوفہ سیٹ تھا۔ اس کے قریب دیوار پر دو شمع دان آویزاں تھے۔ لائبریری کی الماریوں میں تالے نہیں تھے۔ والفورڈ ایک الماری کے قریب پہنچا۔ کتابیں دیکھتے دیکھتے اس نے الماری کا پٹ کھولا۔ انگریزی کی ایک کتاب نکالی۔ ورق گردانی کی تو یہ عقدہ کھلا کہ اب تک کسی نے کتاب کھول کر پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ جلد بندی کے دوران جو اوراق ایک دوسرے سے چپاں رہ گئے تھے، وہ ابھی تک جوں کے توں تھے۔ نہ کتاب زیر مطالعہ آئی نہ اوراق کاٹ کر علیحدہ کئے گئے۔

خان بہادر قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے یہ صورت احوال دیکھی تو بہت خفیف ہوا۔ اس نے فوراً بات بنائی۔ "یہ کتاب میں بہت شوق سے خرید کر لایا تھا مگر طرح طرح کی مصروفیات میں کچھ ایسا الجھا رہا کہ اسے پڑھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔"

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔" والفورڈ نے مسکرا کر اس کی تائید کی اور کتاب الماری میں وہیں رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی۔

کتابوں کے مطالعے سے نہ والفورڈ کو دلچسپی تھی اور نہ ہی خان بہادر کو۔ اس کی دلچسپی صرف مخطوطات اور قلمی نسخوں سے تھی جن کی خاطر اس نے لائبریری کا اہتمام کیا تھا۔ وہ لائبریری

میں صرف اسی وقت جاتا تھا جب کوئی خاص مہمان آتا۔ وہ اسے بڑے فخر سے قلمی نسخے اور مخطوطات دکھاتا۔ ان کے بارے میں تفصیل سے بتاتا۔ لائبریری سے دراصل اسے اتنا ہی لگاؤ تھا۔ وہ اب تک خاندانی رئیسوں اور امراء کی اس وضع داری کو نباہ رہا تھا جب لائبریری کی موجودگی امارت اور خوش ذوقی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔

مخطوطات اور قلمی نسخے فارسی میں تھے یا اردو میں۔ والفورڈ دونوں ہی زبانوں سے نابلد تھا۔ البتہ ان کی خطاطی میں اس نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ زیادہ دیر لائبریری میں نہ ٹھہرا۔

لائبریری کے آگے اونچی شہ نشین تھی۔ صاف ستھرے فرش پر میز اور کرسیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ دونوں لائبریری سے گزر کر شہ نشین پر پہنچے۔ والفورڈ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "لائبریری، خاص طور پر آپ کی آرٹ گیلری بہت شاندار ہے۔ اسے دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ آپ نے خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"اگر آپ اس جگہ کو پہلے دیکھتے تو بڑی مایوسی ہوتی۔" خان بہادر نے اسے بتایا۔ "یہ عمارت ہمیشہ سے ایسی نہ تھی۔ یہ ایک بنئے کی حویلی تھی۔ بنیوں کے پاس پیسہ تو آگیا۔ مگر رہنے سہنے کا ڈھنگ اب تک نہ آیا۔ حویلی کیا تھی، بالکل کبوتروں کی ڈھابلی لگتی تھی۔ اسے توڑ جگہ جگہ سے توڑ پھوڑ کر میں نے اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کرائی ہیں۔ وقت بھی بہت لگا اور خرچ بھی بہت آیا۔ مگر اب یہ اس قابل ہو گئی ہے کہ میں آپ کے جیسے کسی معزز مہمان کو یہاں خوش آمدید کہہ سکتا ہوں۔"

دونوں گفتگو کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں ایک ملازم نے اسکاچ وہسکی کی بوتل، گلاس اور جگ میں پانی رکھ دیا۔ اس نے دو پیگ بنائے اور دونوں کے سامنے رکھ دیئے۔ انھوں نے گلاس اٹھا کر آہستہ سے ٹکرائے اور ایک ایک گھونٹ بھرا۔

یہ گلابی جاڑوں کی ایک خوش گوار شام تھی۔ آفتاب ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی سنہری دھوپ درختوں کی بلندی پر جگمگا رہی تھی۔ لحیم شحیم والفورڈ کے سامنے پستہ قد خان بہادر عبدالباری حقیر اور کم تر نظر آ رہا تھا۔ مگر وہ بہت مسرور تھا۔ عرصہ دراز بعد اسے ایک ایسا قدردان ملا تھا جس کے سامنے وہ اپنی امارت اور خاندانی وجاہت کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ وہ بات بات پر بے تکلفی سے قہقہے لگاتا اور اپنے بزرگوں کی رئیسانہ شان و شوکت کا تذکرہ کرتا۔

لیکن والفورڈ کو خان بہادر کی خاندانی عظمت سے زیادہ اپنے اس صنعتی منصوبے کی فکر تھی جس کے بارے میں وہ خان بہادر سے تفصیل کے ساتھ بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی برطانوی فرم کا ڈائریکٹر تھا اور اس کے ایشیائی امور کا انچارج تھا۔ اس کی فرم کے سائیگان میں کئی کارخانے تھے۔ لیکن ویت نام کی جنگ نے شدت اختیار کی اور حالات روز بروز بدسے بدتر ہونے لگے تو دوسرے غیر ملکی اداروں کی طرح اس کی فرم نے بھی کارخانے بند کرکے کاروبار سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کے فیصلے کے مطابق ایسے ممالک میں سرمایہ کاری کرنے کا جائزہ لے رہا تھا جہاں اس کے مفادات محفوظ ہوں۔ اس سلسلے میں وہ پاکستان بھی آیا تھا۔ خان بہادر سے چند ہی روز قبل ایک مشترکہ شناسا کی وساطت سے ملاقات ہوئی تھی۔ خان بہادر بھی بعض بڑے زمیں دار خاندانوں کی اتباع میں زمینداری کے ساتھ ساتھ صنعت کار بننے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔

والفورڈ نے گلاس اٹھایا۔ وہسکی کی چسکی لگائی اور چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”میں نے اپنے ایک پروجیکٹ کا جو خاکہ دیا تھا، میرا خیال ہے اس پر آپ اچھی طرح غور کر چکے ہوں گے۔“

”میں نے اسے دیکھا تھا۔ بلکہ اپنے منیجر سے اس کے بارے میں مشورہ بھی کیا تھا۔“ خان بہادر نے بتایا۔ ”مگر آپ کا منصوبہ کچھ جچا نہیں۔ کاسمیٹکس کے علاوہ کیا دوسری اشیاء کی پیداوار کے لئے کارخانہ نہیں لگایا جا سکتا؟“

”کیوں نہیں لگایا جا سکتا۔“ والفورڈ نے کھل کر اختلاف رائے نہ کیا۔ مسکراتے ہوئے بولا ”مگر ایشیا کے دوسرے پس ماندہ ممالک کی طرح اس ملک کی کالی کلوٹی اور بدصورت عورتوں کے لئے سنگھار اور زیبائش کا ساز و سامان بھی ایک اہم بنیادی ضرورت ہے۔ سوسائٹی میں عورت کی اہمیت کا انحصار بڑی حد تک اس کے حسن پر ہوتا ہے۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے یہ اس کا بہت موثر حربہ ہوتا ہے۔“

اس نے گلاس اٹھا کر وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ ”میری فرم نے ایک بین الاقوامی ایجنسی کے ذریعے سرمایہ کاری کے امکانات کے بارے میں جو سروے کرایا تھا اور اس سروے میں جو اعداد و شمار

پیش کئے گئے ہیں، ان کے مطابق یہاں ہر سال کئی ملین روپے کا کاسمیٹکس کا سامان بیرونی ممالک سے امپورٹ کیا جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں ایسی اشیاء کی کتنی کھپت ہے۔ پیداوار تو اسی مال کی جاتی ہے جس کی بازار میں مانگ ہو۔ یہ تو کاروبار کا بنیادی اصول ہے۔“ والفورڈ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لئے ایک بار پھر کہا ”درحقیقت اس ملک کی کالی کلوٹی اور بدصورت عورتوں کے لئے تو۔“

”آپ نے اس ملک کی عورتوں کو ابھی دیکھا کہاں ہے۔“ خان بہادر نے فوراً مداخلت کی ”یہاں بھی بہت حسین عورتیں ہوتی ہیں اور بہت گوری چٹی بھی ہوتی ہیں۔ یہ جو آپ کو یہاں میں کالی کلوٹی اور بدشکل عورتیں نظر آتی ہیں، ان کے لئے تو کالا کلوٹا اور بدصورت ہونے ہی میں عافیت ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی خوبصورت ہوئی تو وہ وڈیرے کے چنگل سے نہیں بچتی۔ وہ اسے اٹھوا کر داشتہ بنا لیتا ہے۔ کسی ہاری یا کسان کے لئے تو خوبصورت لڑکی عذاب ثابت ہوتی ہے۔ نہ عزت محفوظ نہ جان و مال۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا ”میں تو آپ کو یہ مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ کاسمیٹکس کے چکر میں نہ پڑیئے۔ یہ ہمارا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کے ملک کے حالات اور ہیں اور ہمارا سب سے سنگین مسئلہ تو سیم و تھور ہے۔“

”سیم اور تھور تو بہت سنگین مسئلہ ہے اور وہ ہمارے دائرہ کار سے باہر ہے۔“ والفورڈ نے صاف گوئی سے اپنی محدودات کا اظہار کیا۔ ”لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ کے ملک کی زرعی معیشت ہے۔ ہم کو اس پہلو سے اپنے منصوبوں کو دیکھنا ہو گا۔ اس سلسلے میں آپ کی اور کیا بنیادی ضروریات ہیں؟“

”اچھی کھاد نہیں ملتی۔ یہ بھی بنیادی ضرورت ہے۔“

والفورڈ نے کچھ نہ کہا خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے خان بہادر عبدالباری کو مخاطب کیا۔

”مسٹر باری! فرٹیلائزر فیکٹری لگانے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

”یہ بات کہی آپ نے دل لگتی۔“ خان بہادر چہک کر بولا اور کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے وہسکی کی چسکی لگائی ”میرے ذہن میں پہلے ہی ایک ایسا منصوبہ تھا۔ بلکہ صاف بات یہ ہے کہ میرے ایک قریبی عزیز نے اس طرف توجہ دلائی تھی۔ وہ ماہر معاشیات ہے اور اعلیٰ سرکاری

عہدے پر فائز ہے۔ مجھے اس کا مشورہ ایسا مناسب معلوم ہوا تھا کہ میں نے یہیں اپنے علاقے میں فرٹیلائزر فیکٹری لگانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ اس کے لئے قطعۂ آراضی کا بھی بندوبست کر لیا۔"

"یہ آپ کی اپنی اراضی ہے؟"

"ہے تو یہ شاملات کی زمین مگر میں نے اسے متاجری پر حاصل کر لیا ہے۔ ویسے یہ زرعی اراضی ہے مگر اسے کمرشیل میں تبدیل کرانا مشکل نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں متعلقہ افسران سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔" خان بہادر عبدالباری نے بات کرتے کرتے نشے کی دُھن میں یہ بھی بتا دیا۔ "اس پر کچھ لوگوں نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ مگر میں نے ان کو بے دخل کر کے زمین اپنے قبضے میں لینے کا کام شروع کر دیا ہے۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟" والفورڈ نے دبی زبان سے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

خان بہادر کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس مرحلے پر کسی ایسی بات کا اظہار والفورڈ کے سامنے قطعی نامناسب تھا۔ خان بہادر نے مسکرا کر فوراً اسے اطمینان دلایا۔ "آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ میرا قانونی حق ہے اور ان کا قبضہ بالکل ناجائز ہے۔ خیر یہ کام تو ہو جائے گا۔ مگر اتنا بڑا کارخانہ لگانے کے لئے جتنے بڑے سرمائے کی ضرورت ہے وہ نہ میرے پاس ہے اور نہ ہی حکومت اور مقامی بینک اس سلسلے میں مدد کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔"

"سرمائے کی آپ پرواہ نہ کریں اس کا بندوبست ہماری فرم کرے گی۔" والفورڈ نے اسے یقین دلایا۔ "آپ سے ابتدائی امور طے ہو جائیں تو میں جلد ہی اس کی فیزابیلٹی تیار کرانے کا کام شروع کرا دوں گا۔"

والفورڈ کا گلاس خالی ہو چکا تھا۔ وہ بوتل اٹھا کر اپنے لئے پیگ بنانے لگا۔

✡

سورج اب مغربی افق پر سنہرے تھال کی مانند نظر آ رہا تھا۔ دھوپ مٹیالی پڑ گئی تھی۔ سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ شام کی آمد آمد تھی۔ یکایک دلشاد احمد ایک طرف سے نمودار ہوا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ خان بہادر نے اسے پریشانی کے عالم میں دیکھا تو اپنی تشویش کا

اظہار کیا۔

"دل شاد! تم کچھ گھبرائے ہوئے نظر آ رہے ہو۔ خیریت تو ہے؟"

دل شاد نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے آگے بڑھا۔ خان بہادر کے قریب پہنچا اور دھیمے لہجے میں بتانے لگا۔ "سر! جس بات کا مجھے خطرہ تھا وہی ہوا۔ ہمارے کارندے زمین پر قبضہ کرنے کے لئے پہنچے تو جو لوگ اس پر قابض ہیں وہ مزاحمت پر آمادہ ہو گئے۔ وہ مرنے مارنے پر کمربستہ ہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ مورچے بنا کر پتھراؤ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ سب کلہاڑیوں سے مسلح ہیں۔"

"کیا صورت حال بہت سنگین ہو گئی ہے؟" خان بہادر نے دریافت کیا۔

"جی ہاں، بہت سنگین ہو گئی ہے۔" پرائیویٹ سیکرٹری دلشاد احمد نے مطلع کیا۔ "ہمارے کارندوں کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

"کیا کارندے مسلح ہو کر نہیں گئے تھے؟"

"سب بندوقوں سے مسلح ہیں۔" دلشاد نے خان بہادر کو بتایا۔

"مینجر علی نواز کہاں ہے؟"

"میں نے انھیں صورت حال کی نزاکت سے مطلع کیا تو وہ فوراً اسی طرف چلے گئے۔ میرا خیال ہے۔ وہ اب تک وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔"

"سالے کمینوں کی یہ ہمت۔ وہ ہیں کس ہوا میں۔" خان بہادر نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "مینجر کو جا کر میرا یہ حکم پہنچاؤ۔ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے اور وہ سرکشی سے باز نہ آئیں تو گولی چلوا دی جائے۔ جیسے بھی بنے ان کو قابو میں کیا جائے۔ کسی طرح نرمی نہ ہونی چاہیے۔ بندوقوں کی باڑھ پر رکھ کر ایک ایک حرام زادے کو گولیوں سے اڑا دیا جائے۔"

ناگاہ شام کے سناٹے میں بندوقیں چلنے کی خوف ناک آوازیں ابھریں۔ ان کے ساتھ ساتھ زور زور سے چیخنے چلّانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔

والفورڈ نے حواس باختہ ہو کر خان بہادر سے پوچھا۔ "یہ بندوق چلنے کی آوازیں ہیں؟ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگوں کے چیخنے چلّانے کا شور بھی سنائی دے رہا ہے۔"

"جی ہاں، یہ بندوقوں کی ہی آوازیں ہیں۔" خان بہادر نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "وہ لوگ جنہوں نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے، زمین خالی کرنے میں کچھ مزاحمت کر رہے ہیں۔"

"اوہ، تو یہ آگ یہاں تک پہنچ گئی۔" والفورڈ کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

"آپ مطلق فکر نہ کریں۔ ایسا تو اکثر ہوتا رہتا ہے۔ کوئی خاص بات نہیں۔" خان بہادر نے مسکرا کر بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

والفورڈ نے کسی ردّعمل کا اظہار نہ کیا۔ فائرنگ کی آوازیں رک رک ابھر رہی تھیں اور چیخنے چلّانے کا شور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ یکایک والفورڈ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت دہشت زدہ نظر آ رہا تھا۔

خان بہادر نے مسکرانے کی کوشش کی "مسٹر والفورڈ! آپ کھڑے کیوں ہو گئے؟ ابھی تو آپ سے فیکٹری لگانے کے بارے میں بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں کوئی بات نہیں کر سکوں گا۔"

"ارے، آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو گئے۔" خان بہادر نے بے نیازی سے کہا۔

والفورڈ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پرائیویٹ سیکرٹری کو مخاطب کیا "مسٹر احمد! آپ میرے ساتھ آئیے۔"

"پلیز، میری بات تو سنیئے۔"

خان بہادر نے والفورڈ کو روکنے کی کوشش کی۔ مگر اس نے ایک نہ سنی۔ مڑا اور آگے بڑھا۔ دلشاد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں دیکھتے ہی دیکھتے خان بہادر کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ خان بہادر نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

گولیوں کی تڑتڑ اور انسانی آوازوں کا شور کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ خان بہادر خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ فضا میں بارود کی بو رچی ہوئی تھی۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ آخر بے چین ہو کر خان بہادر اٹھ کھڑا ہوا اور اس سمت چلا جدھر والفورڈ اور دل شاد گئے تھے۔

وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ سامنے سے دلشاد آتا ہوا نظر آیا۔ خان بہادر رک کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ دلشاد نزدیک آیا تو اس نے پوچھا "کیا مسٹر والفورڈ چلے گئے؟"

"جی ہاں، وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔"

"کچھ بتا کر گئے ہیں کہ ان سے کب ملاقات ہوگی؟"

"وہ بہت دہشت زدہ اور پریشان لگ رہے تھے۔" دل شاد نے مطلع کیا۔ "میں نے آئندہ ملاقات کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے صرف اتنا کہا۔ فی الحال اس کا کوئی امکان نہیں۔ میں صبح کی فلائٹ سے واپس لندن جا رہا ہوں۔"

"یہ سالا کوئی خاندانی انگریز نہیں تھا۔ ضرور اس کے نطفے میں فرق ہوگا۔ یہ تو بہت بزدل نکلا۔" خان بہادر نے جھنجلا کر اپنے فوری ردعمل کا اظہار کیا۔ "سالے کی اتنے سے واقعے سے سٹّی گم ہو گئی۔ ایک انگریز وہ تھے جو اپنے سامنے کھڑے ہو کر گولی چلواتے تھے۔ مجال ہے کہ ذرا بھی چہرے سے پریشانی یا خوف آشکارہ ہو۔ جبھی تو اس شان سے حکومت کی کہ ان کے نام سے رعیّت کا دم نکلتا تھا۔ بڑے بڑوں کا پِتّا پانی ہوتا تھا۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "وہ بھی کیا دن تھے۔"

دل شاد خاموش رہا۔ شام کا اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں اب بند ہو گئی تھیں۔ چیخنے چلانے کا شور بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔

خاں بہادر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا ایک راہداری میں داخل ہوا۔ دھندلی دھندلی روشنی میں ایک ملازم فرش پر بیٹھا پرانے اور بدوضع جوتے کو پالش کر کے چمکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خان بہادر قریب پہنچا تو ملازم گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

خاں بہادر عبدالباری نے جوتے کو غور سے دیکھا۔ مگر اس کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ خاموشی سے دل شاد احمد کے ہمراہ آگے بڑھ گیا۔

غزل اُس نے چھیڑی

ذکر تھا مشاعروں کا، بات گھوم پھر کر پہنچی سخن فہمی تک۔ دو گھنٹے کی بحث کا یہ نتیجہ نکلا کہ شعر کہنے کے لیے اگر خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے تو سخن فہمی میں دماغ کی چولیں ہل جاتی ہیں مصرعہ اُٹھانا اور بھی مشکل مسئلہ ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ رفاہِ عام کلب لکھنؤ، میں بزمِ مشاعرہ منعقد تھی۔ شمع ثاقب لکھنوی کے سامنے آئی۔ انھوں نے صدا دینے لگے، دعا دینے لگے کی زمین میں غزل پیش کی۔ مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ آخری شعر کا جب انھوں نے مصرعۂ اولیٰ پڑھا۔

آئینہ ہوتا اگر میرا عشق اُن کے حسن کا

سامعین میں سے کسی نے مصرعہ اٹھایا: آئینہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حسن کا۔ ثاقب مرحوم نے نظر اٹھا کر مصرعہ اٹھانے والے کی جانب دیکھا۔ زیرِ لب تبسم فرمایا۔ قدرے تامل کیا اور پھر اُنھی صاحب کو مخاطب کر کے شعر پڑھا۔

آئینہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حسن کا
کیا مزا ہے درد میں جب خود ہی دوا دینے لگے

مشاعرہ ختم ہوا تو ثاقب لکھنوی نے ان صاحب کو جا کر گلے سے لگا لیا۔ گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ انھوں نے زندگی میں کبھی ایک شعر نہیں کہا۔ البتہ شعر سننے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ صرف مشاعرہ سننے کی غرض سے بنارس سے لکھنؤ آئے تھے۔

اب تو وہ مشاعرے ہی نہ رہے۔ شاعر مائیکروفون پر غزلیں پڑھتے ہیں۔ اُن کی آواز تو سامعین تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر دوسری جانب کی آواز نقار خانہ میں طوطی کی صدا بن کر

رہ جاتی ہے۔ ورنہ ایک زمانہ تھا کہ مشاعروں میں اساتذہ اپنے شاگردوں کے جمِ غفیر کے ساتھ آتے تھے۔ مصرعہ زبان سے نکلا اور اُٹھانے والوں نے اٹھا لیا۔ داد و تحسین کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ رعایتِ لفظی، صوتی حسن، تیور، زبان، قافیہ، روزمرّہ، محاورہ، شعر کا کون سا پہلو تھا جسے اُجاگر نہ کیا جاتا۔ غالب نے اسی لئے اہلِ فن سے شکوہ کیا تھا۔

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

نوحہ گر کا ذکر آگیا ہے تو لگے ہاتھوں ایک واقعہ اور سن لیجئے۔ ۱۹۴۳ء میں الٰہ آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ نوح ناروی سے نیاز حاصل کرنے کا اشتیاق کشاں کشاں امتیاز منزل (اُن کے مکان کا صحیح نام مجھے یاد نہیں) لے گیا۔ حضرت نوح بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر دبی زبان سے میں نے کلام سننے کا اشتیاق ظاہر کیا مگر وہ ٹال گئے۔ بڑا تعجب ہوا۔ سنا تو یہ تھا کہ وہ سخن فہموں کو ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور اپنا کلام ذوق و شوق سے سناتے ہیں۔ یہاں معاملہ برعکس تھا۔ ذرا دیر بعد حرفِ طلب پھر زبان پر لایا۔ لیکن بات نہ بنی آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اِدھر سے اصرار، اُدھر سے انکار۔ اسی اثنا میں ایک صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ چھریرا جسم۔ چہرہ پر چگّی ڈاڑھی، آنکھوں میں دُنبالہ سرمہ، کلّے میں پان، صاف ستھرا مکلّف لباس۔ اس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے جیسے بتاشوں پر چل رہے ہوں۔ اُن کے آتے ہی محفل کا رنگ بدل گیا۔ ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی نے بلا کسی تمہید کے بیاض نکالی اور غزل شروع کر دی۔ لیکن تخاطب انھی صاحب سے تھا۔ حضرت نوح ناروی نے مطلع پڑھا۔

کسی بے درد کو ظلم و ستم کا شوق جب ہوگا
یہ میرا ایک دل لاکھوں دلوں میں منتخب ہوگا

وہ صاحب اچھے بھلے بیٹھے حقّے سے شوق فرما رہے تھے۔ مطلع کا پہلا مصرع سنتے ہی ایک بارگی زمین سے کئی بالشت اوپر اُچھل گئے اور دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر نعرہ لگایا۔

"ہائے کیا ظالم شعر نکالا ہے"

نوح ناروی نے مطلع مکرّر پڑھا۔ اس دفعہ انھوں نے اور بھی جگر دوز نالہ بلند کیا اور لقا

کبوتر کی طرح فرش پر لوٹنے لگے۔ بار بار کہتے تھے۔

"بس بھیا، اب نہیں سُنا جاتا۔ ہائے کیا بات پیدا کی ہے۔ کسی بے درد کو ظلم و ستم کا شوق حبیب ہو گا۔"

انھوں نے صرف اس ایک مصرعہ کو خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی بیس مرتبہ تو پڑھا ہو گا۔ عالم یہ تھا کہ آنکھوں سے اشک جاری۔ زبان پر اف اور ہائے مٹھیاں بھینچی ہوئیں۔ اُن پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔

پوری غزل گھنٹہ بھر میں ختم ہوئی۔ وہ تمام وقت آہیں بھرتے رہے۔ فرش پر زخمی پرندے کی طرح پھڑکتے رہے۔ کبھی منہ پیٹتے، کبھی سینہ۔ اسی عالم میں ایک بار جب انھوں نے زور سے ہائے کرکے آنکھیں بند کر لیں تو میں واقعی گھبرا گیا۔ بات یہ تھی کہ انھی دنوں شاہجہاں پور کی ایک خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی کہ کسی بزم سماع میں قوالوں نے مشہور صوفی شاعر بیدم وارثی کے عارفانہ کلام کا یہ شعر لیک کر گایا

آتے ہیں ہنسانے کو، جاتے ہیں رُلانے کو
اس آنے کو کیا کہیئے، اس جانے کو کیا کہیئے

مشائخ میں سے ایک بزرگ تڑپ گرا تھے۔ ان پر ایسا حال طاری ہوا کہ عالم وجد میں اُن کا وصال ہو گیا۔

میں نے سوچا، کہیں ایسا نہ ہو کہ زمین شق ہو جائے اور اس میں سے ایک ہاتھ بلند ہو۔ زیر زمین یہ صدا سنائی دے۔

"بس! میرا پردہ نہ فاش کر۔"

اور یہ صاحب واقعی داغ مفارقت نہ دے جائیں۔ پولیس علامہ نوح ناروی کے ساتھ مجھے بھی گواہی میں نہ کھینچے۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ان صاحب کی نوحہ گری نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ ان صاحب کو دنیا میں اور کوئی کام نہیں تھا۔ صرف نوح ناروی کا کلام سنتے تھے۔ کھانا اُن کے ساتھ کھاتے تھے۔ رہنے کو مکان بھی نوح صاحب نے دے

رکھا تھا۔ اوپر کے اخراجات کے بھی کفیل تھے۔ معلوم نہیں کہ اب بھی وہ نوحہ گری کا شغل فرماتے ہیں یا خدانخواستہ کسی دن فنا فی الشعر ہو گئے۔

اسی قبیل کے ایک سخن شناس سے ہردوئی میں ملاقات ہوئی۔ وہ ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ عرف عام میں مرزا صاحب کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ تقریب ملاقات یہ ہوئی کہ ضلع کچہری میں میرا ایک مقدمہ تھا۔ سننے میں آیا کہ جج بڑا خر دماغ ہے۔ جھل کھا گیا تو مقدمہ ستیاناس کرکے رکھ دے گا۔ لوگوں نے مرزا صاحب کا نام لیا اور یہ مشورہ دیا کہ اگر وہ سفارش کر دیں تو کام سولہ آنے بن جائے گا۔ بڑی مشکل سے ان کے مکان کا پتہ ملا۔ مکان کاہے کو تھا، کسی قدیم عمارت کا کھنڈر معلوم ہوتا تھا، جس کے ایک حصہ میں انھوں نے ٹاٹ کے پردے ڈال کر چار دیواری کھڑی کر لی تھی۔

اتفاق سے وہ اس وقت گھر پر موجود تھے۔ پہلی ہی آواز پر برآمد ہوئے۔ حلیہ یہ تھا کہ بدن پر بوسیدہ بنیان۔ گھٹنوں تک اونچا تہہ بند۔ خشخشی ڈاڑھی جو پان کی پیک سے لالہ زار ہو رہی تھی۔

میں نے موصوف کو دیکھا تو دل میں شک پڑ گیا۔ سوچا، بھلا اس ٹٹ پونجئے کو کون خطرے میں لائے گا۔ بہرحال ان سے ملا۔ حرفِ مدعا زبان پر لایا۔ مسکرا کر بولے: "تم ناحق اس قدر پریشان ہوئے۔ میاں! اس سے تو کان پکڑوا کے تمہارا کام کرا دوں گا۔" اُن کے اس طنطنے سے شک اور قوی ہو گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا پیشی کے دن انھیں ساتھ لے کر عدالت میں حاضر ہوا۔

مرزا صاحب نے جج کو کئی بار جھک جھک کر آداب کیا۔ مسکرائے بھی۔ بار بار سامنے سے گذرے۔ جج نے مطلق توجہ نہ دی۔ ذرا گھاس نہ ڈالی۔ میں نے دیکھا، بات بنتی نظر نہیں آتی۔ پیشکار کو دو روپے دے کر مقدمہ کی تاریخ بڑھوا دی۔ پہلے تو مرزا صاحب منع کرتے رہے، پھر نیم رضامند ہو گئے۔ واپسی پر کہنے لگے۔

"تم دل چھوٹا نہ کرو۔ یہ دو روپے بھی اس مرغی والے سے وصول نہ کئے تو مرزا نہ کہنا، میراثی کہنا۔ ذرا آج شام کو گھر آکر تماشہ دیکھنا۔"

شام کو ان کے گھر جانے کو دل نہ چاہتا تھا مگر اس خیال سے چلا گیا کہ جھوٹے کو اس کی منزل تک پہنچا دوں۔ جاڑے کا موسم تھا۔ میں سرِ شام ہی اُن کے گھر پر جا دھمکا۔ انھوں نے گھر کے اندر ایک تنگ سی کوٹھڑی میں مجھے بٹھا دیا۔ اس وقت وہ جلال میں تھے۔ بات بات پر تاؤ آجاتا۔ تیوری پر بل ڈال کر کہتے "آخر اس نے مجھے سمجھا کیا۔ جج ہو گا اپنے گھر کا۔ جسے غرض ہوگی دس دفعہ یہیں آئے گا۔"

اسی طرح باتیں کرتے کرتے نو بج گئے۔ میں نے عاجز آکر اٹھنا چاہا تو انھوں نے اصرار کر کے روک لیا۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی۔

مرزا صاحب کے لڑکے نے آکر بتایا کہ جج صاحب کا نوکر آیا ہے۔ آپ کو بلایا ہے۔ انھوں نے کہلوا دیا "ملازم سے جاکر بتا دو کہ میری طبیعت آج کچھ ناساز ہے۔" ذرا دیر بعد انھوں نے پھر کسی کو بھیجا۔ مگر مرزا صاحب نے دہلیز سے باہر قدم نہ نکالا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے پیغام بھیجتے رہے۔

بیس منٹ کے اندر اندر معلوم ہوا کہ جج صاحب خود دروازے پر کھڑے ہیں۔ مگر مرزا صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بیٹھے بڑبڑاتے رہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے پاس کون سا نقش سلیمانی تھا جو جج صاحب کو یوں کشاں کشاں کھینچ لایا تھا۔ میں ابھی اس راز پر غور ہی کر رہا تھا کہ باہر سے جج صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"میں نے بستر منگوا لیا ہے۔ اب یہیں دھرنا دے کر بیٹھے جاتا ہوں۔"

یہ گویا انتہا تھی۔ آخر میرے بہت سمجھانے بجھانے پر مرزا صاحب باہر گئے۔ دیر تک گلہ شکوہ ہوا۔ بات صرف اتنی تھی کہ جج صاحب نے گذشتہ شب نئی غزل کہی تھی۔ ہر دوئی بھر میں اُن کو صرف مرزا صاحب سخن فہم ملے تھے۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ غزل کہی جائے اور مرزا صاحب سے داد وصول نہ کی جائے۔ یہ تو ایسا ہی تھا کہ نیکی کر کے دریا میں ڈال دی جائے۔

بہر صورت مرزا صاحب کی سخن فہمی آڑے آگئی اور پہلی ہی پیشی پر مقدمہ میرے حق میں خارج ہو گیا۔

فیض آباد کے ایک حکیم صاحب تھے، جن کے متعلق مشہور تھا کہ اُن کے پاس کوئی

ملازم ہفتہ بھر سے زیادہ نہ ٹکتا تھا۔ چند ہی دن میں بھاگ کھڑا ہوتا۔ سنا ہے حکیم صاحب کام تو کم لیتے تھے مگر غزلیں زیادہ سناتے تھے۔

صفی لکھنوی سے ایک واقعہ منسوب ہے۔ نوجوانی کا عالم تھا۔ ایک روز کہیں سے تھکے ہارے گھر لوٹ رہے تھے۔ اچانک سامنے نظر پڑی۔ دیکھا، شوق قدوائی کی فٹن آرہی ہے۔ دیکھتے ہی ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ قریب ہی برگد کا گھنا پیڑ تھا۔ لپک کر اُس کے تنے کی اوٹ میں دبک گئے۔ مگر بچ نہ سکے۔ ذرا ہی دیر بعد فٹن درخت کے پیچھے آکر ٹھہر گئی۔ صفی مرحوم نے گردن اٹھا کر دیکھا، شوق قدوائی فرشتہ اجل کی طرح سر پر کھڑے تھے۔ ہنس کر بولے۔

"تم نے سوچا تھا کہ بچ کر نکل جاؤ گے۔ یہ خبر ہی نہ تھی کہ میں نے دور ہی سے تم کو دیکھ لیا تھا۔ چلو ابھی میرے ساتھ۔"

صفی بیچارے بڑے پریشان ہوئے۔ بہت سے عذر پیش کئے مگر بات بن نہ سکی۔ آخر عاجز آکر بولے "صبح کا گھر سے نکلا ہوا ہوں، لحظہ بھر کو جاکر صورت تو دکھا آؤں۔ ورنہ گھر والے نہ جانے کیا سوچیں گے۔" شوق قدوائی نے یہاں بھی نکلنے نہ دیا۔ اپنے ساتھ فٹن میں بٹھایا اور خود مکان کے دروازے تک گئے۔ ان کو اندر جانے نہ دیا۔ کہنے لگے: "تم پھر ہاتھ نہیں آؤ گے۔" با دل نخواستہ صفی نے دروازے ہی پر سے آواز لگائی۔

"ارے بھئی سن رہی ہو۔"

اندر سے بیوی نے پوچھا "یہ آپ دروازے پر کھڑے کیوں آوازیں لگا رہے ہیں۔ اندر کیوں نہیں آتے؟"

صفی بولے "اندر کیسے آؤں۔ گرفتار کر لیا گیا ہوں۔"

وہ گھبرا کر بولیں "اے ہے! خیریت تو ہے۔"

کہنے لگے "بس خیریت ہی ہے۔ میرا کہا سُنا معاف کر دینا۔ یہی کہنے آیا تھا۔ شوق قدوائی کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

شوق قدوائی مسکرا کر بولے "تم اب تیز ہوتے جا رہے ہو۔" قدرے تامل فرمایا

پھر گویا ہوئے: "بہارِ ادب کے سالانہ مشاعرے کے لئے نئی غزل کہی ہے اور بڑی مشکل زمین میں کہی ہے۔ جی چاہا کہ پہلے تم کو سنا دوں۔" صفی دم بخود بیٹھے رہے۔ شوق قدوائی نے کوچوان کو اشارہ کیا۔ فٹن آگے بڑھی۔ صفی لکھنوی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

کچھ اسی نوعیت کا ایک حادثہ میرے ایک دوست کے ساتھ پیش آیا۔ اودھ کے ایک رئیس تھے جنہیں اور بہت سے رئیسانہ چونچلوں کے ساتھ ساتھ شعر کہنے کا بھی مراق تھا۔ اُن کے لئے سخن فہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر مہیا کئے جاتے۔ مضافات لکھنؤ میں رہتے تھے۔ لہٰذا شہر سے سخن شناسوں کو درآمد کیا جاتا تھا۔ اسٹیشن پر اُن کے آدمی لگے رہتے۔ ادھر ٹرین سے کوئی خوش پوش اُترا اور انہوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گھیر گھار کر تعلقدار صاحب کی حویلی پر لے آئے۔

میرے دوست کا بیان ہے کہ وہ بھی اس چکر میں پھنس گئے۔ گئے تھے کسی مریض کی عیادت کو مگر راستہ ہی میں تعلقدار صاحب کے حواریوں سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ انھوں نے ایسا نرغے میں لیا کہ سیدھے حویلی پہنچے۔ وہاں اُن کے لیئے ہر طرح کے تکلفات مہیا کئے گئے۔ لیکن جب انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی آتنی ضخیم بیاض سے غزلیں سننا پڑیں تو دماغ کی چولیں تک ہل گئیں۔ بڑی مشکل سے دو بجے رات کو جان چھوٹی۔

بستر پر جا کر لیٹے تو تھوڑی ہی دیر بعد یہ عقدہ کھلا کہ باہر سے قفل ڈال دیا گیا ہے۔ دن بھر نگرانی ہوتی رہی۔ دو آدمی منکر نکیر کی طرح ہر وقت آگے پیچھے لگے رہتے۔ دوسرے ہی دن زندگی وبالِ جان ہو گئی۔ نکلنے کے تمام راستے بند تھے۔ چند ہی روز میں رنگ زرد پڑ گیا۔ راتوں کو گڑگڑا کر دعا مانگتے کہ اے پروردگار! اس مصیبت سے نجات دلا۔ آخر ایک روز اللہ کا نام لے کر رات کے پچھلے پہر دوسری منزل کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ خیریت ہوئی کہ زمین نرم تھی۔ لہٰذا ہاتھ پاؤں ٹوٹنے سے بچ گئے۔ واپس گھر پہنچے تو حلیہ یہ تھا کہ نہ سر پر ٹوپی، نہ پیر میں جوتا۔ کپڑے مٹی کی رنگت ہو گئے تھے۔ بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں ایک رات حوالات میں بھی بند رہے۔

لکھنؤ میں ایک شاعر تھے، پرنس ہادی مرزا۔ خود کو نواب واجد علی شاہ کا پوتا بتاتے تھے۔ وضع داری کا یہ عالم تھا کہ جاڑا، گرمی، برسات، کوئی بھی موسم ہو، ان کی وضع قطع میں سرمو

فرق نہ آتا۔ سر پر سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی۔ بدن پر جامہ وار کی اچکن، پیر میں ایک بر کا کھلا پائجامہ۔ ہمیشہ گھیتلی جوتی پہنتے تھے اور شانوں پر کڑھا ہوا رومال پڑا ہوتا۔ وثیقہ دار بھی تھے۔ لیکن وثیقہ اتنا قلیل ملتا تھا کہ مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ زود گو اس غضب کے تھے کہ روزانہ ایک عدد غزل کہہ لیتے تھے اور اُسے بڑے تکلّف سے سناتے تھے۔ ہاتھ جوڑ کر عجز و انکسار کا اظہار کرتے۔ جھک، جھک کر آداب بجالاتے، بار، بار کہتے: "بندہ کس قابل ہے۔ حضور کی ذرّہ نوازی ہے۔" غزل ختم ہوتے ہی دوسری کے لئے زمین ہموار کرنا شروع کر دیتے۔

آندھی آئے، پانی آئے، مگر پرنس ہادی مرزا ہر شام بلاناغہ مہلا دیا لہ کالج کے سامنے والے چائے خانہ میں شعر سناتے نظر آتے تھے۔ انھی کے ہمراہ ایک اور شاعر کو دیکھا تھا۔ باقر رضوی تخلص کرتے تھے۔ کچھ اس قسم کے شعر کہتے تھے۔

زلفیں سنواریئے مرا احوال ہے سو ہے
تم کو کسی کے حالِ پریشاں سے کیا غرض

ان کو بھی شعر سنانے کا عارضہ تھا۔ کسی مقامی اخبار میں کام کرتے تھے۔ ایک بار اخبار میں ہڑتال ہو گئی۔ سنا ہے کہ ہڑتالیوں کے مطالبات میں ایک مطالبہ یہ بھی شامل تھا کہ باقر رضوی پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ دفتر میں بیٹھ کر غزلیں نہ سنایا کریں۔ وہ ان دنوں نخاس میں رہتے تھے۔ دفتر سے ہمیشہ یکّے پر واپس جاتے تھے۔ یکّے والے انھیں دیکھتے ہی دور سے آوازیں لگانا شروع کر دیتے۔ اڈّے پر اچھی خاصی گڑبڑ مچ جاتی۔ آخر وہ کسی نہ کسی یکّے پر سوار ہو جاتے۔ جب یکّہ ذرا دُور نکل جاتا تو یکّے والا غزل سنانے کی فرمائش کرتا۔ وہ تھوڑا بہت تکلّف کرنے کے بعد شروع ہو جاتے۔ یکّے پر سے اُترتے تو ہمیشہ ڈبل کرایہ ادا کرتے۔

سننے میں آیا ہے کہ ایک بار تین نئی غزلیں سنا کر انھوں نے یکّے والے کو صرف کرایہ دیا تو وہ ان کے سر ہو گیا۔ کہنے لگا: "میاں یہ تو مزدوری کے پیسے ہوئے اور وہ جو آدھی درجن غزلیں سنی ہیں اُن کا کرایہ؟" یکّے والے کی بد ذوقی پر وہ اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ احباب سے رخصت ہوتے وقت انھوں نے آبدیدہ ہو کر کہا تھا۔

"بھئی لکھنؤ میں اب رہنے کا بھرم نہیں رہا۔ یہاں اب جوہر شناس نہیں رہے۔"

جن لوگوں کو نواب جعفر علی خاں اثر سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ سخن فہموں کی قدر شناسی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں نے ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ سے ایک ادبی ماہنامہ نکالا تھا۔ اس سلسلے میں اثر صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ میرے ایک دوست بھی ہمراہ تھے۔ اثر صاحب کے دیرینہ نیازمند تھے۔ اکثر ان کے دولت کدہ پر حاضر بھی ہوتے رہتے تھے ادب نواز اور سخن شناس بھی تھے۔

جس وقت ہم دونوں پہنچے تو نو یا دس بجے دن کا وقت تھا۔ تکلفاً کلام سنانے کی درخواست کی۔ جسے اثر صاحب نے بلا کسی عذر کے قبول بھی کر لیا۔

غزلوں کا دَور شروع ہوا تو دوپہر ہو گئی۔ کھانا آگیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی نظموں کا دَور چلا۔ سہ پہر ہو گئی۔ چائے پینے کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رات ہو گئی۔ پھر کھانا آیا۔ اس سے فارغ ہوئے تو ترجمے سننا پڑے۔ رات کے پچھلے پہر جب گلو خلاصی ہوئی تو شہر سنسان پڑ چکا تھا۔ دوست کا مکان نزدیک تھا۔ ان کو تو یہ صحبت زیادہ مہنگی نہ پڑی۔ لیکن مجھے لگ بھگ پانچ میل پیدل چلنا پڑا تو طبیعت ہَری ہو گئی۔

یہ تو غزل گو شعرا کی باتیں تھیں۔ نظم کہنے والے بھی کبھی کبھی اس علت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ سلام مچھلی شہری اردو کے نامور شاعر ہیں۔ بڑی خوبصورت نظمیں کہتے ہیں ان کے متعلق ایک لطیفہ بیان کیا جاتا ہے۔ شانِ نزول اس کی یوں ہے کہ ایک بار سلام نے ایک طویل نظم کہی اور اسے سنانے صاحبزادہ محمود الظفر کے پاس پہنچے۔ وہ ان دنوں یو پی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے۔ بے حد مصروف اور وقت کے پابند آدمی تھے۔ سلام نے جا کر ان کو اپنی نظم سنائی۔ نظم آزاد تھی۔ محمود الظفر کو یوں بھی شاعری سے کوئی خاص شغف نہیں۔ آزاد نظم اور بھی بار خاطر گزری۔ آدھی نظم تو انھوں نے بڑے صبر و سکون کے ساتھ سنی۔ اس کے بعد اپنی بیوی ڈاکٹر رشید جہاں کو آواز دی۔ "ارے بھئی رشیدہ، ذرا آکر سلام کی یہ نظم سن لو۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔" انھوں نے مزید کچھ نہ کہا اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ کچھ دیر بعد ڈاکٹر رشید جہاں نے یہ ڈیوٹی کامریڈ نعیم کے سپرد کی اور خود کسی مریض کو دیکھنے چلی گئیں۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب میں لکھنؤ میں تھا۔ کراچی آکر معلوم ہوا کہ شعر سنانے کا مرض اور سخن فہموں کی قدر و منزلت یہاں اور بھی زیادہ ہے۔

میں یہاں کے ایک ایسے شاعر کو جانتا ہوں جو بڑی صاف ستھری اور پاکیزہ غزلیں کہتے ہیں۔ بظاہر خاصے سمجھ دار نوجوان ہیں۔ سرکاری ملازم ہیں۔ رہنے کو حکومت نے کوارٹر بھی دے رکھا ہے، مگر رہائش کے لئے تیرے میرے دَر جھانکتے پھرتے ہیں۔ ان کے کوارٹر میں ایک میر صاحب اپنے پورے ٹبّر کے ساتھ عرصہ دراز سے مقیم ہیں۔ وہ صرف اس لئے کوارٹر خالی نہیں کرا سکتے کہ میر صاحب سخن فہم ہیں۔ ان کی غزلیں سنتے ہیں اور اس ڈھب سے داد دیتے ہیں کہ شاعر صرف خواب دیکھتا ہے اور میر صاحب لمبی تان کر سوتے ہیں۔

یہ بھی کراچی ہی کا واقعہ ہے۔ ایک بار عارف جلالی کے ساتھ ایک شاعر سے ملاقات ہوئی۔ شید الگجراتی تخلص کرتے ہیں بڑے اصرار سے ایک چائے خانہ میں لے گئے۔ ترنم سے غزل شروع کی۔ ابھی مطلع ہی پڑھا تھا کہ چائے خانے کے بیرے نے آکر مداخلت کی۔ سیٹھ بولتا ہے یہاں قوالی نہ گاؤ۔" مجبوراً اٹھنا پڑا۔ چند روز بعد پھر اس چائے خانہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کاؤنٹر کے پیچھے آویزاں تختی میں ترمیم کر دی گئی تھی۔ لکھا تھا۔

یہاں شراب پینا، سٹہ کھیلنا اور قوالی گانا منع ہے۔

چلتے چلتے ایک ٹیپ کا بند بھی سن لیجئے۔ الٰہ آباد کے ایک شاعر ہیں۔ جب تک ہندوستان میں رہے، صرف غزلیں کہتے رہے اور داد وصول کرتے رہے۔ کراچی آئے تو پیٹ پوجا کیلئے کلرکی کرنا پڑی لیکن شاعری کا چسکہ نہ چھوٹا۔ غزل کہنا تو چھوڑ دی مگر سننے کا شوق بدستور قائم رہا۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا والی بات تھی۔ شعرائے کرام ان کے یہاں جاتے۔ غزلیں سناتے۔ داد وصول کرتے۔ چائے اور سگریٹ پیتے۔

بے فکروں کی بن آئی۔ لیکن چند ہی ماہ بعد کلرک بیچارے کی بیوی کے زیورات بکنے کی نوبت آگئی۔ انھی دنوں ایک شاعر مجھے ان کے مکان پر لے گئے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ میرے شاعر دوست نے حسب معمول ذرا دیر تکلف سے کام لیا۔

پھر کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوئے: "کل رات کچھ شعر ہو گئے تھے۔" یہ کہہ کر انھوں نے آہستہ آہستہ گنگنانا شروع کیا۔ مگر میزبان نے فوراً ٹوکا۔

"میں ابھی آیا۔"

وہ گھر کے اندر چلے گئے۔ ذرا دیر بعد ایک چھپا ہوا کارڈ ہاتھ میں دبائے ہوئے واپس آئے۔ کہنے لگے: "غزل بعد میں پڑھنا پہلے اسے دیکھ لو۔" شاعر نے اسے پڑھا تو چہرہ غصّے سے سرخ پڑ گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کاغذ لے لیا۔ یہ ریٹ کارڈ تھا۔ جس پر لکھا تھا۔

غزل (تحت اللفظ) زیادہ سے زیادہ دس شعر ——— ایک روپیہ

غزل (ترنم کے ساتھ) ——— ایک روپیہ آٹھ آنے

نوٹ:۔ دس شعر کے بعد فی شعر چار آنے مزید معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔

قطعہ ——— آٹھ آنے

نظم ——— دو روپے

آزاد نظم ——— پانچ روپے

اسی طرح دیگر اصناف سخن کی اُجرت درج تھی۔ میرے شاعر دوست کھسیاتے ہو کر بولے: "اماں، یہ کیا بد مذاقی ہے؟"

انھوں نے بات نظر انداز کرتے ہوئے رسید بک نکالی اور قلم سنبھال کر بولے: "کتنے کی رسید کاٹ دوں؟"

یہ مذاق کیسا بھی ہو، مگر یہ کارگر ثابت ہوا۔ ہم دونوں ذرا ہی دیر بعد اٹھے اور منہ لٹکائے چلے آئے۔ میرا خیال ہے اس شاعر نے وہاں جانے کی زحمت پھر گوارا نہ کی ہوگی۔

چور دروازہ

(۱)

تڑاق سے کوئی چیز فرش پر گری۔ یہ شیشے کے برتن کے ٹوٹنے کی آواز تھی۔ میں گہری نیند سو رہا تھا۔ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ ذرا دیر بعد ایک اور چھناکا ہوا۔ پھر تو لگاتار چھن چھن کر کے شیشے ٹوٹنے لگے۔ میز اور کرسیاں گرنے اور ٹوٹنے لگیں اور ان کے ساتھ ساتھ دھما دھم کی آوازیں آنے لگیں شور اوپر کی منزل پر ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو آدمی گتھم گتھا ہو کر بڑے وحشیانہ انداز میں لڑ رہے ہیں۔

جاڑوں کی سنسان رات تھی۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے بُرا حال تھا۔ میں لحاف میں دبکا ہوا سکتے کے سے عالم میں خاموش پڑا رہا۔ کئی منٹ بعد رات کے سناٹے میں پروفیسر کی آواز سنائی دی۔ وہ غصہ سے چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"بے ہودہ، بدتمیز، نامعقول کہیں کا۔"

"نکل جاؤ یہاں سے۔"

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔"

پھر لکڑی کے زینے پر بھاری بھاری قدموں کی آہٹ ابھری۔ دروازہ تیزی سے کھلا اور بند ہو گیا۔ میں اسی طرح سہما ہوا بستر میں لیٹا رہا۔ ذرا دیر بعد میرے کمرے کے دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔

"شہیر! مسٹر شہیر!"

یہ پروفیسر کی آواز تھی۔ اس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ میں نے اس وقت اٹھ کر دروازہ کھولنا مناسب نہ سمجھا۔ مسٹ مارے پڑا رہا۔ پروفیسر رک رک کر دھیمے لہجے میں مجھے

پکارتا رہا۔ آخر اس نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ شخص تو بڑی خراب نیند سوتا ہے" اور بڑبڑاتا ہوا اوپر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد بھی مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔ بے چینی سے پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔

سویرے جب میں پروفیسر کے پاس گیا تو دیکھا، کمرے میں شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ان میں ٹوٹے ہوئے گلاس تھے۔ گلدان تھے۔ تصویروں کے فریم تھے۔ ایک طرف وہسکی کی خالی بوتل بھی پڑی تھی۔ کمرے کا سارا فرنیچر الٹا پلٹا ہوا تھا۔ سامنے ایک ٹوٹے ہوئے صوفہ پر پروفیسر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کا چہرہ ویران اور اجڑا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہونٹ خشک تھے آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے تمام رات اسی ٹوٹے ہوئے صوفے پر جاگ کر گزاری ہے۔ اسی عالم میں اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

اسے پریشان دیکھ کر میں نے پوچھا۔ "پروفیسر صاحب خیریت تو ہے؟"

بڑی بیزاری سے بولا۔ "جی ہاں، سب خیریت ہی ہے۔" پھر اس نے کمرے میں بکھرے ہوئے سامان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ "دیکھ نہیں رہے ہیں، آپ یہ خیریت۔"

میں نے اظہارِ تعجب کرتے ہوئے پوچھا۔ "آخر یہ ہوا کیا؟"

وہ اسی طرح تلخ لہجے میں بولا۔ "مجھ سے سوال کرنے کے بجائے تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں کتنا احمق واقع ہوا ہوں۔" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی بات کا کیا جواب دوں۔ آخر وہ خود ہی کہنے لگا۔ "اس دور کا المیہ سب سے بڑا یہ ہے کہ آج انسان بے حد اذیت کوش ہو گیا ہے۔"

اس بات کا بھی کمرے میں بکھرے ہوئے ٹوٹے پھوٹے سامان سے بظاہر کوئی تعلق معلوم نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا کچھ کہتے ہوئے مجھے جھجک محسوس ہوئی۔ مجھے خاموش پا کر وہ بڑے نپے تلے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بات صرف اتنی ہے کہ گذشتہ شب کوئی گیارہ بجے ایاز صاحب تشریف لائے تھے۔ طبیعت میری خراب تھی، لہٰذا جلدی سو گیا تھا۔ انھوں نے مجھے زبردستی جگایا۔ نشے میں دھت ہو رہے تھے۔ قدم کہیں پڑ رہے تھے کہتے کچھ تھے اور زبان سے نکلتا کچھ تھا۔ آتے ہی جیب سے بوتل نکالی اور شغلِ بادہ نوشی شروع کر دیا۔ میرے سپرد ساقی گری کی خدمت ہوئی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں رات کے وقت اپنی ضرورت کے لئے بھی کبھی ملازم کی نیند خراب نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ جو آرڈر کرتے گئے میں اس کی تعمیل کرتا رہا۔" وہ بڑے اطمینان سے ایک ایک تفصیل بتا رہا تھا۔ اب نہ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ

تھی اور نہ لہجے میں تلخی۔ البتہ باتوں میں بلا کا طنز تھا۔ "تو صاحب مجھ سے کچھ حکم عدولی ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ آپے سے باہر ہو گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا اندازہ آپ کمرے کی حالت دیکھ کر لگا سکتے ہیں۔ وہ اودھم دھاڑ مچایا کہ اب میں آپ سے کیا عرض کروں"

میں نے کہا: "شور تو کل رات کچھ میں نے بھی سنا تھا۔"

وہ مسکرا کر بولا: "آپ تو بڑی گہری نیند سوتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو آوازیں بھی دیں مگر آپ کی آنکھ نہ کھل سکی۔" وہ اس وقت بڑے تکلف کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔

میں نے سخن سازی سے کام لیا اور پشیمانی کا اظہار کرنے لگا: "نیند تو واقعی میری بہت خراب ہے۔ میرے سر کے اوپر اتنا بڑا ہنگامہ ہوا اور میری آنکھ تک نہیں کھلی۔" پھر میں نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو آپ کے ساتھ بڑی زیادتی ہے"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا: "زیادتی، ہاں بھئی یہی کہہ لو۔" میں نے سوچا کہ زیادتی کا لفظ استعمال کر کے میں نے پروفیسر کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ یہ تو سراسر ظلم ہے۔ لہٰذا میں نے اس کی تلافی کرنے کی غرض سے کہا۔

"معاف کیجیے گا پروفیسر صاحب۔ مجھے صحیح طور پر آپ دونوں کے مراسم کا اندازہ نہیں مگر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ایاز کا اب یہاں آنا جانا بند کرا دیجیے۔"

وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا: "اب یہی میں نے بھی سوچا ہے۔"

میں نے اس سلسلہ میں مزید کچھ کہنا خلاف مصلحت سمجھا۔ علاوہ ازیں دفتر کا وقت ہو گیا تھا۔ میں پروفیسر سے رخصت لے کر دفتر کی جانب چل دیا۔ لیکن راستہ بھر میں اس کے متعلق سوچتا رہا۔ دل ہی دل میں اس کی ضرورت سے زیادہ فراخ دلی اور شریف النفسی پر کڑھتا بھی رہا۔

(۲)

میری نئی نئی ملاقات تھی۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے ابھی ہفتہ بھر بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ میرے بڑے بھائی کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ لہٰذا اس کے ذاتی حالات کے متعلق مجھے بہت کچھ علم تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے حالات کے خلاف بغاوت کرنے کی جرأت نہیں کی، ہمیشہ زندگی سے سمجھوتہ قائم رکھا اس سمجھوتہ بازی میں حادثات کو بہت بڑا دخل تھا۔ وہ مشکل سے دس برس کا تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں نے پچھلے گھر کی بہو بیٹیوں کی طرح اپنی اولاد ہی کو سب کچھ جانا اور انھی کے سہارے پورا رنڈاپا گزار دیا۔ عزیزوں

نے عقد ثانی کے لیے بہت اصرار کیا مگر انھوں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اس انکار سے خاندان والوں سے کچھ اس قدر بدمزگی بڑھی کہ انھوں نے سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ بات کی اتنی دھنی تھیں کہ برے سے برا وقت دیکھا مگر کسی رشتہ دار کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ شوہر نے مرتے وقت اتنا بھی اثاثہ نہ چھوڑا جس سے سال چھ مہینے کٹ جاتے۔ جہیز میں جو دو چار زیور ملے تھے وہی کل سرمایہ تھا۔ جنہیں فروخت کر کے انھوں نے کپڑے سینے کی مشین خرید لی۔ پاس پڑوس میں رہنے والوں کے کپڑے سی کر اپنا اور چار بچوں کا پیٹ پالتی رہیں۔

جس وقت باپ کا انتقال ہوا وہ چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ بیوہ ماں نے کسی نہ کسی طرح اس کی تعلیم جاری رکھی۔ خود اُسے بھی پڑھنے کی لگن تھی۔ دن بھر اسکول میں پڑھتا۔ شام کو ایک جلد ساز کی دکان پر کاغذ کاٹنے کی مشین چلاتا جس سے پڑھائی کی فیس نکل آتی۔ رات کو اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں جلانے کا تیل ختم ہو جاتا تو وہ میونسپلٹی کے لیمپ کی روشنی میں جا کر رات گئے تک پڑھا کرتا۔ دھندلی روشنی میں آنکھوں پر زور دے کر پڑھنے سے بینائی خراب ہو گئی۔ چنانچہ کم سنی ہی میں اس نے موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ غرض کہ اس نے ابتدائی زندگی بڑی تنگ دستی میں بسر کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر برسرِ روزگار ہوا تو تین جوان بہنوں کی شادی کی فکر دامن گیر ہوئی۔

سب سے چھوٹی بہن کی شادی کے فرض سے تین چار سال ہی ہوئے ہوں گے کہ وہ فارغ ہوا تھا۔ خود اب تک بیاہ نہیں کیا تھا۔ ماں زندہ ہوتیں تو شاید وہ ازدواجی زندگی میں الجھ جاتا۔ مگر اب کون ایسا تھا جو گھر بسانے کے لئے مجبور کرتا۔ بہنیں اپنے گھر بار کی ہو چکی تھیں۔ اب اس کی عمر بھی پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ سر کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ چہرے کے خد و خال بھدے ہو گئے تھے۔ قویٰ مضمحل ہوتے جا رہے تھے۔ زیادہ ذہنی مشقت کرنے کے باعث وہ اپنی عمر سے زیادہ سن رسیدہ معلوم ہونے لگا تھا۔

گھر میں وہ بالکل تنہا رہتا تھا۔ دیکھ بھال کے لیے ادھیڑ عمر کا ایک ملازم تھا جو بہرہ بھی تھا اور اسے سجھائی بھی کم دیتا تھا۔ ان خامیوں کے باوجود وہ کئی سال سے اس کے ساتھ نباہ رہا تھا۔ لیکن مجرد اور عزلت نشینی کی زندگی سے آدمی کا مزاج جس قدر وہمی اور چڑچڑا ہو جاتا ہے وہ اس میں نام کو نہیں تھا۔ پہلی بار جب میں بھائی جان کا خط لے کر اس کے پاس گیا تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا تھا۔ خط پڑھتے ہی بولا: "نہیں میاں! تم کو یہاں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ نیچے کا کمرہ میں خالی کرائے دیتا ہوں۔ آج ہی اپنا سامان لے کر آ جاؤ۔" چنانچہ شام کو ہوٹل سے اپنا سامان اٹھوا کر اس کے گھر میں منتقل ہو

گیا۔ وہ ان دنوں ایک مقامی کالج میں وائس پرنسپل تھا اور انگریزی پڑھاتا تھا۔

یوں تو دن بھر میں اس سے میری کئی بار ملاقات ہوتی تھی لیکن بات چیت کرنے کے معاملے میں وہ سنبھل سے کام لیتا تھا۔ البتہ ایاز کا ذکر کبھی آجاتا تو وہ ذرا کھل کر بات کرتا تھا۔

ایاز سے ابھی تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پروفیسر کی گفتگو سے مجھے اس کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ جب پروفیسر اس شہر میں نیا نیا آیا تھا، اسی زمانہ میں ایاز سے اس کی جان پہچان ہوئی تھی۔ وہ اس کے پاس کیریکٹر سرٹیفکیٹ لینے آیا تھا۔ کہیں ملازمت کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سرٹیفکیٹ اسی مقصد کے لیے درکار تھا۔ ایاز نے اسی سال میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا والد پر فالج گرا تھا۔ وہ اپاہجوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بڑے بھائی پر گھر کا سارا بار تھا، لہذا وہ آگے تعلیم دلانے کے حق میں نہیں تھا۔ پروفیسر نے گفتگو کی تو ذرا ہی دیر میں اسے ایاز کی ذہانت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ اس سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ ملازمت کا خیال ترک کروا کے اُسے تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ خود ایاز کی بھی یہی خواہش تھی چنانچہ بی اے تک اس کی تعلیم کا سارا بار پروفیسر برداشت کرتا رہا۔ اب وہ کسی سرکاری محکمہ میں اچھے عہدہ پر ملازم ہو گیا تھا۔

شام کو دفتر سے لوٹتے ہی میں سیدھا پروفیسر کے پاس پہنچا۔ شام کی چائے ہم دونوں بلا ناغہ ایک ساتھ پیتے تھے۔ اوپر جا کر میں نے دیکھا۔ میز پر چائے کا سامان رکھا تھا۔ اس روز کچھ خاص اہتمام بھی کیا گیا تھا، مگر پروفیسر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے اس کی لائبریری میں جا کر دیکھا۔ وہاں بھی موجود نہیں تھا۔ اب تو تشویش ہوئی اس لیے کہ وہ اپنا بیشتر وقت لائبریری ہی میں گزارتا تھا۔

لائبریری سے نکلتے ہوئے اچانک میری نظر برابر والے کمرے کی جانب اٹھ گئی۔ پروفیسر قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو حیرت سے چونک پڑا۔ اس وقت وہ شوخ رنگ کی بش شرٹ پہنے بڑے بے ڈھنگے پن سے مسکرا رہا تھا۔ حیرت کی بات ہی تھی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ پروفیسر کے ایسا زاہد خشک، لڑکیوں کے پیچھے سڑکوں پر سیٹیاں بجانے والے آوارہ گرد لڑکوں کی سی وضع قطع اختیار کر سکتا ہے۔ دل ہی دل میں کہا یہ اپنا پروفیسر تو بڑا چھپا رستم نکلا۔ میں نے اس کمرے میں جانا مناسب نہ سمجھا۔ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف چل دیا۔

پروفیسر نے مجھے ٹوکا: "ارے بھئی شہیر! تم آگئے، کہاں چلے؟ ادھر آؤ۔"

غالباً اس نے آئینہ میں میرا عکس دیکھ لیا تھا۔ مجبوراً مجھے اس کے پاس جانا پڑا۔ اس کی بش شرٹ قریب سے دیکھی تو بڑی ہنسی معلوم ہوئی۔ اس پر جگہ جگہ خبروں کے تراشے تھے کہیں سمندر کے کنارے کوئی دوشیزہ ریت پر لیٹی اپنی ننگی ٹانگوں کی نمائش کر رہی تھی، کہیں کوئی نوجوان جوڑا بڑے شہوت انگیز انداز میں بوس و کنار میں محو تھا۔ اس بش شرٹ کو پہن کر وہ اچھا خاصہ ٹیڈی بوائے نظر آرہا تھا۔

پروفیسر میری نظروں کو بھانپ گیا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر کہنے لگا: "وہ بے غیرت آج پھر آیا تھا۔" یہ ایاز کی جانب اشارہ تھا۔ پروفیسر کے لہجے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ رات کے افسوس ناک واقعہ پر اس نے ایاز کو معاف کر دیا ہے۔

میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا: "کون؟"

اس دفعہ وہ کسی قدر بے تکلفی سے بولا: "وہی نامعقول ایاز کا بچہ اور کون۔ ابھی ذرا ہی دیر پہلے تو یہاں سے گیا ہے۔"

اس کی اس بات پر میں جل کر رہ گیا۔ عجیب سادہ لوح آدمی ہے۔ کل رات جس شخص نے اسے اس قدر پریشان کیا، آج اس کا اس طرح تذکرہ کر رہا تھا گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

پروفیسر مجھے خاموش دیکھ کر بولا: "یہ سارا الم غلم سامان خرید کر وہی لایا ہے۔"

میں نے دیکھا، کمرے میں ایک طرف کئی شوخ رنگ کی ٹائیاں اور رومال، پرفیوم کی شیشیاں اور اسی طرح کی کئی بش شرٹیں پڑی تھیں جو اس وقت پروفیسر پہنے ہوئے تھا۔ سامان دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ اس پر دو ڈھائی سو روپے خرچ ہوئے ہوں گے۔ اگر پروفیسر کو منانے کے لیے ایاز اتنی رقم خرچ کر سکتا ہے، تب تو پروفیسر کا اس طرح من جانا بے جا نہیں تھا۔ میں نے ازراہ تمسخر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے ایاز کو آپ کے ٹیسٹ کا بخوبی اندازہ ہے۔"

وہ شرمندہ ہو کر گویا ہوا: "یہ نئی بات نہیں۔ وہ اکثر ایسی حرکتیں کیا کرتا ہے۔ ایک تو یہ فضول سامان اٹھا لیا۔ اس پر یہ اصرار کہ اسے پہنو بھی۔ میرے سر ہو گیا۔ زبردستی یہ بش شرٹ پہنا کر گیا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ یہ بش شرٹ مجھ پر کیا اچھی لگے گی؟"

میں نے اس کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ اس بیزاری میں بھی کہیں اس کے دل کا چور چھپا ہوا تھا۔

میں نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں پروفیسر صاحب! سچ مچ یہ تو آپ پر بہت کھل رہی ہے۔ بڑے اسمارٹ نظر آرہے ہیں۔"

جھوٹ موٹ کی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے بولا "اب تم مجھے بیوقوف بنانے کی تو کوشش کرو نہیں"

میں اس بات کا جواب دینے ہی والا تھا کہ اسی اثنا میں دروازہ پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ میں نے سوچا، شاید ایاز آیا ہے۔ پروفیسر گھبرا کر بولا۔

"دیکھو وہ میری اسٹوڈنٹ عذرا آئی ہوگی۔ تم جاکر اسے بٹھاؤ۔ میں ابھی کپڑے تبدیل کرکے آتا ہوں۔"

میں نے دروازہ پر جاکر دیکھا، سانولے رنگ کی ایک شرمیلی سی لڑکی وہاں کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا "آپ اندر آجائیے۔ پروفیسر صاحب ابھی آتے ہیں۔"

میری بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اندر جاکر چپ چاپ صوفہ پر بیٹھ گئی۔ ذرا ہی دیر بعد پروفیسر بھی وہاں آگیا۔ وہ رنگ برنگی بش شرٹ کمرے میں اتار آیا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ سانولے رنگ کی شرمیلی لڑکی عذرا میرے سامنے پروفیسر سے بات کرتے ہوئے کچھ جھجھک سی رہی تھی۔ لہذا میں نے جلدی جلدی چائے کی پیالی ختم کی اور وہاں سے اٹھ کر نیچے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کچھ دیر بعد پروفیسر میرے کمرے میں گھبرایا ہوا آیا "آج تم باہر گھومنے نہیں گئے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے" اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر چلا گیا۔ لمحہ بھر بعد وہ پھر کمرے میں آگیا۔ آتے ہی وہی سوال کیا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا" اور اسی طرح گھبرایا ہوا کمرے سے چلا گیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد لکڑی کے زینہ پر اس کے قدموں کی آہٹ ابھری۔

ایک بار وہ پھر کمرے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ لیکن اس دفعہ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ ڈھونڈنے کے سے انداز میں نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اس کی اس گھبراہٹ نے مجھے بھی خواہ مخواہ پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ میں ابھی تک یہ طے نہیں کر سکا تھا کہ اس وقت اس سے بات کرنا مناسب بھی ہوگا کہ نہیں۔ پھر وہ خود ہی بولا۔

"تم سے ایک کام تھا"

میں نے بڑی مستعدی سے جواب دیا "فرمائیے"

مگر وہ اپنی بات کہتے کہتے رک گیا۔ پھر سر کے بالوں کو کریدتے ہوئے بولا "تمھارے پاس اس وقت

چالیس روپے تو نہیں ہوں گے؟"

میں نے جلدی سے کہا "جی ہاں! ابھی حاضر کئے دیتا ہوں۔"

میں نے اسی وقت روپے نکالے اور اُسے دے دیئے۔ روپے لے کر وہ کہنے لگا "پہلی تاریخ کو تم مجھ سے لے لینا۔ اس وقت کچھ ایسی ہی ضرورت پیش آگئی تھی۔"

اس نے بات کرنے کا مجھے موقع ہی نہ دیا۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے تو اس نے اپنا جملہ پورا کیا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے زینے پر چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔ میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ پروفیسر اتنا گھبرایا ہوا کیوں تھا۔ کئی اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں میرے ذہن میں گھومنے لگیں۔ اسی دوران میں پروفیسر اس لڑکی کے ساتھ ساتھ نیچے آیا۔ وہ تو باہر چلی گئی البتہ پروفیسر میرے پاس آگیا۔ اب اس کے چہرے پر گھبراہٹ نہ تھی بلکہ وہ کسی قدر بشاش نظر آرہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بھئی تم نے اس وقت بہت بڑا کام کیا ہے۔"

میں نے کہا "آپ خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں"

"بھئی اس لڑکی کی ابھی تک فیس جمع نہیں ہو سکی۔ فائنل ائیر ہے۔ بے چاری بے حد پریشان تھی۔ اپنا حال یہ ہے کہ اس مہینے ایاز نے کچھ قرض لے لیا تھا۔ لہذا اپنی جیبیں بالکل خالی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس کی فیس کے لیے روپیہ فراہم کروں۔ مگر تم نے"

میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا "دیکھئے پروفیسر صاحب! آپ مجھے بار بار شرمندہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"

وہ مسکرا کر خاموش ہوگیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

لیکن دوسرے ماہ کی ابتدائی تاریخوں میں ہی مجھے یہ بات معلوم ہوگئی کہ عذرا کے علاوہ اور بھی کئی طالبعلم تھے جن کی وہ وقتاً فوقتاً امداد کیا کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ کا ایک حصہ اسی مد میں چلا جاتا تھا۔ اس کا ذاتی خرچ زیادہ نہیں تھا۔ بڑی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اسے صرف ایک ہی شوق تھا۔ اور وہ تھیں کتابیں۔ ہر مہینہ وہ کچھ کتابیں خرید کر ضرور لاتا، اس طرح اس نے بڑی اچھی لائبریری بنالی تھی۔ زیادہ تر وہ اسی میں بیٹھ کر اپنا وقت گزارتا تھا۔

(۳)

اتوار کا دن تھا۔ پروفیسر نے صبح ہی صبح الماریوں سے کتابیں نکال کر فرش پر جگہ جگہ انبار لگا دیئے

تھے اور ان کو نئے ڈھنگ سے آراستہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس کام میں اس قدر مصروف تھا کہ اس روز اس نے چائے بھی وہیں پی۔

دوپہر کو میں اس کے پاس گیا۔ مگر وہ کتابوں کی ترتیب میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ اس وضع قطع میں وہ بڑا اُول جلُول نظر آرہا تھا۔ مگر اسے اپنے کپڑے کا ذرا ہوش نہیں تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اسی وقت ایک بوسیدہ سی کتاب پر اس کی نظر پڑ گئی۔ وہ اسے اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ ایک جگہ حاشیہ پر کوئی عبارت درج تھی۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھنے لگا اور پڑھنے میں کچھ ایسا محو ہو گیا کہ میری موجودگی کا احساس ہی اس کے ذہن سے نکل گیا۔ میں کئی منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ مگر اس نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں۔ میں اپنی موجودگی کو مداخلت بے جا سمجھتے ہوئے کمرے میں واپس آگیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے سے کچھ دیر پہلے میں پھر اس کے پاس گیا۔ تب تک وہ ساری کتابیں قرینے سے آراستہ کر چکا تھا۔ اس وقت وہ بڑا مسرور نظر آرہا تھا۔ بلاشبہ اس نے کتابوں کی ترتیب میں بڑی نفاست سے کام لیا تھا۔ دن بھر کام کرتے کرتے اب وہ بہت تھک چکا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ذرا دیر اس سے بات چیت کروں گا۔ مگر اس دفعہ بھی بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ کوئی پروگرام نہ تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر سینما چلا گیا۔

پہلے شو میں بڑا رش تھا۔ اس لیے ٹکٹ نہیں مل سکا۔ لیکن سینما دیکھنے کا اس روز چونکہ پروگرام بنا چکا تھا لہٰذا دوسرا شو دیکھا اور رات کو کوئی ساڑھے بارہ بجے گھر پہنچا۔ اوپر کی منزل میں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔

پروفیسر ابھی تک جاگ رہا تھا دروازہ کھلا تھا۔ روشنی لائبریری میں ہو رہی تھی۔ میں اسی طرف چل دیا۔ مگر دروازہ پر پہنچ کر میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

سامنے فرش پر ہر طرف کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ بعض کتابیں پھٹ گئی تھیں۔ ان کے اوراق ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ الماریاں الٹی پلٹی پڑی تھیں۔ ان کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ لائبریری کے آتش دان میں ابھی تک کئی کتابیں جل رہی تھیں ہوا کا جھونکا آتا تو شعلے بھڑک اٹھتے۔ میں گم صم حیران اور پریشان نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔

ایک گری ہوئی الماری سے ٹیک لگائے، بکھری ہوئی کتابوں کے درمیان، پروفیسر فرش پر بت بنا بیٹھا تھا۔ لحظہ بھر کو میری نظریں، اس کی نظروں سے ٹکرائیں۔ اس کی آنکھوں میں اس بلا کا کرب تھا کہ میں تاب نہ لا سکا۔ خود بخود میری نگاہیں جھک گئیں۔

کئی لمحہ خاموشی میں گزر گئے۔ پھر کمرے کے گہرے سکوت میں پروفیسر کی آواز ابھری "کب آئے تم؟" اس کے لہجہ میں درد کی کسک تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس وقت وہ بہت بوڑھا نظر آرہا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پھر کہا۔

"تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟" وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ "میں ان کو پھر درست کر لوں گا۔"

میں نے پوچھا۔ "یہ آپ کو سوجھی کیا؟ کتنی تن دہی سے تو آپ نے لائبریری کو آج دن بھر آراستہ کیا تھا۔" میری بات پر وہ ذرا کھل کر مسکرایا۔ پھر اس نے بڑا بے تکا سا سوال کیا۔

"تمھارا نام شبیر احمد ہے نا؟"

میں نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔"

اس کا دوسرا سوال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پوچھنے لگا۔ "تم واکر اینڈ واکر میں سپروائزر بھی ہو؟"

میں نے اس دفعہ بھی اس کی بات کا صحیح مفہوم سمجھے بغیر کہہ دیا۔ "جی ہاں!"

"اور اس وقت تم میری لائبریری میں کھڑے ہو؟" پھر وہی بے تکا سوال۔

میں نے رٹے ہوئے سبق کی طرح پھر "جی ہاں" کہہ دیا۔ لیکن اس کے کسی اور بے تکے سوال سے قبل ہی میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "ان سوالوں سے آخر آپ کا مطلب کیا ہے؟"

وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں اور جب میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں تو پھر لائبریری کا یہ حلیہ میں کیسے بنا سکتا ہوں۔"

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔" میں نے فوراً وضاحت کی۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور آتش دان میں سلگتی ہوئی ایک کتاب دیکھنے لگا۔ جس کی جلد چیخ کر دو حصوں میں پھیل گئی تھی کمرے میں دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ آتش دان میں انگارے دہکتے رہے۔ دریچے سے کبھی کبھار ہوا کا کوئی تیز جھونکا آتا تو شعلے بھڑک اٹھتے اور فرش پر بکھرے ہوئے

اوراق کھڑکھڑانے لگتے۔ ایک بار پھر اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اسی عالم میں وہ کہنے لگا۔

"تم اس سارے ہنگامے کی وجہ جاننے کے لیئے بے چین معلوم ہو رہے ہو۔ بھئی بات صرف اتنی ہے کہ شام کو تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد عذرا آگئی۔ اسے دو کتابوں کی تلاش تھی۔ اتفاق سے دونوں ہی کتابیں میرے پاس نکل آئیں۔ میں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس سے ان کتابوں کے موضوع پر بات کر رہا تھا! اسی اثنا میں ایاز آگیا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ پیشانی پر بل پڑے تھے۔ میں نے اسے بھی وہیں بٹھا لیا۔ مگر وہ روٹھا ہوا منہ پھلائے خاموش بیٹھا رہا۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ "میں ایاز کی ناراضگی کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ اس اتوار کو اس نے پک نک کا پروگرام بنایا تھا۔ مجھے بڑے اصرار سے بلا گیا تھا۔ لیکن میں کتابوں کی ترتیب میں ایسا پھنسا کہ کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ لہٰذا میں نے عذرا کی موجودگی ہی میں معذرت کرتے ہوئے اسے ساری بات بتا دی۔ اس نے میری باتوں کو خاموشی سے سُنا۔ مگر کسی قسم کا ردِّ عمل ظاہر نہ کیا۔ بت کی طرح چپ بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ اٹھ کر لائبریری میں چلا گیا اور یہاں آکر اس نے جو کچھ کیا وہ تمہارے سامنے ہے۔"

میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے دریافت کیا "آپ نے کوئی مزاحمت نہیں کی؟"

"اگر میں اسے روکتا نہیں تو شاید آج اس نے ساری لائبریری ہی پھونک دی ہوتی۔ ہوا یہ کہ اس کے لائبریری میں جانے کے کچھ ہی دیر بعد میں نے کتابیں گرنے کی آواز سنی تھی۔ لیکن جب ایک الماری شور مچاتی ہوئی فرش پر آگری تو میں گھبرا کر وہاں پہنچا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا اور لائبریری سے کتابوں کے پھٹنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ الماریاں دھڑا دھڑ گر رہی تھیں، شیشے ٹوٹ رہے تھے۔"

وہ بجھے ہوئے لہجے میں مجھے بتاتا رہا "اس وقت تک عذرا بھی میرے ساتھ ہی تھی بلکہ مجھے اچھی طرح یاد ہے وینٹیلیٹر کے راستے اندر جانے کی ترکیب بھی اسی نے بتائی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اندر پہنچا۔ یہ دیکھو گھٹنے پر سے پتلون بھی پھٹ گئی، بازو الگ چھل گیا۔"

وہ مجھے اپنی پھٹی ہوئی پتلون اور زخمی بازو دکھانے لگا۔ میں نے اس کی تکلیف سے متاثر ہوتے بغیر چل کر پوچھا "آخر اتنی سی بات پر ایاز اس قدر دیوانہ کیوں بن گیا؟"

"تم ایاز سے ملے نہیں وہ بڑا سر پھرا اور سرکش نوجوان ہے" پروفیسر نے آہستہ سے کہا "اس لائبریری سے تو اسے ہمیشہ سے بیر ہے وہ اسے قبرستان کہا کرتا ہے۔ اس کا تو قول ہے کہ کتابیں انسانی فکر کی قبریں ہیں۔ زندگی کتابوں سے بھرے ہوئے اس بند کمرے میں نہیں ہے۔ زندگی کوچہ و بازار میں ہے، شراب خانوں اور رقص گاہوں میں ہے۔ اپنی اس بات کو منوانے کے لئے وہ اکثر مجھ سے الجھ پڑتا ہے۔ آج جو اس نے پروگرام بنایا تھا۔ اس میں کچھ بے فکرے نوجوان اور فلرٹ ٹائپ کی تیز و طرار لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ تمام دن ساحلِ سمندر پر بیٹھی کر گانے ناچنے، پانی میں اچھل کود کرنے اور ایسے ہی ہنگامے برپا کرنے کا پروگرام تھا۔" وہ زیر لب مسکرایا "اب تم ہی بتاؤ۔ میں ان لوگوں کے ساتھ اس دھما چوکڑی میں کیا اچھا معلوم ہوتا۔ میں نے اسے سمجھایا بھی۔ مگر وہ برابر یہی کہتا رہا کہ تم خواہ مخواہ خود کو بوڑھا سمجھنے لگے ہو۔ میں نے تو ساٹھ ساٹھ سال کے معمر امریکنوں کو ایسے موقعوں پر عام طور سے قہقہے پہ قہقہے لگاتے دیکھا ہے۔"

پروفیسر اپنی بات کہہ چکا تو معاً مجھے محسوس ہوا کہ تمام برائیوں کے باوجود ایک بات ضرور ہے۔ وہ یہ کہ ایاز واقعی پروفیسر سے بڑا خلوص رکھتا ہے۔ اس نے یہ جو کچھ کیا وہ صرف اس کی ہمدردی میں کیا تھا۔ یہ بات دوسری ہے کہ کبھی کبھی ہمدردی بڑی مہنگی بھی پڑ جاتی ہے۔ ایاز کی جانب سے مجھے جو غم و غصہ تھا وہ اب رفع ہو چکا تھا۔

لیکن پروفیسر نے اسے ابھی تک معاف نہیں کیا تھا۔ اس کا اندازہ میں نے اس طرح لگایا کہ ایک پھٹی ہوئی کتاب کے ورق سمیٹتے ہوئے اس نے بڑے طیش کے عالم میں کہا۔

"شہیر! میں نے یہ کتاب ۱۵ سال پہلے خریدی تھی۔ اس اُلو کے پٹھے نے اسے پھاڑ تو ڈالا مگر اسے کیا خبر کہ اس کتاب کو خریدنے کے لئے میں نے اپنے ایک دوست کی گھڑی چرائی تھی۔ اور رات بھر حوالات میں بند رہنا پڑا تھا۔" وہ اچانک بڑا جذباتی ہو گیا "کسی کو کیا خبر کہ ان کتابوں کے ساتھ میری زندگی کی کتنی دردناک یادیں وابستہ ہیں۔"

دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ بڑی مشکل سے میں نے اُسے وہاں سے اٹھا کر بستر پر پہنچایا۔ ورنہ وہ ساری رات وہیں گزار دیتا۔ ہو سکتا ہے میرے جانے کے بعد وہ پھر وہاں پہنچ گیا ہو۔

اس واقعہ کو ہفتہ بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ پروفیسر سے اکثر ادھر ادھر کی باتیں ہوتیں مگر اس نے بھول کر بھی ایاز کا تذکرہ نہیں کیا۔ میں نے ایک بار چھیڑ کر ایاز کے متعلق پوچھا بھی تو وہ نظر انداز کر گیا۔ گھما پھرا کر پھر اس کے ذکر کو لانا چاہا تو میں نے دیکھا کہ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور چہرہ تمتما اٹھا۔ اس دفعہ ایاز نے واقعی اس کو بہت سخت صدمہ پہنچایا تھا۔

ایک رات خلافِ معمول پروفیسر دیر سے واپس آیا۔ میں اس وقت جاگ رہا تھا۔ میرے کمرے میں داخل ہو کر اس نے اظہارِ معذرت کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا "بھئی معاف کرنا۔ میں نے تم کو ڈسٹرب تو نہیں کیا۔" اس قسم کے تکلفات وہ اکثر کیا کرتا تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ چہرے پر تازگی تھی اور لہجے میں ایک خاص کھرج تھی۔ میں نے جواب دیا "ہرگز نہیں، مگر آج آپ کو اتنی دیر کہاں ہو گئی؟"

وہ بے ساختہ ہنسنے لگا "ارے بھئی کچھ پوچھو نہیں۔ اس نامعقول سے راستے میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ نہ جانے کہاں سے بڑی شاندار کار لے آیا تھا۔ ساتھ میں لڑکیوں کی پوری پلٹن تھی۔ کم بخت ان میں راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔ دیکھتے ہی سب کو چھوڑ چھاڑ میرے پاس آ گیا۔ اتنی بات ضرور ہے کہ وہ میری عزت اب بھی اسی طرح کرتا ہے۔ ذرا دیر تک تو ہم دونوں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ پھر وہ مجھے اپنے ساتھ زبردستی کلب لے گیا۔ بھئی پوکر تو وہ کمال کا کھیلتا ہے یہ تو مجھے آج ہی پتہ چلا۔ ذہین اس بلا کا ہے کہ آج تو سارے لوگ دنگ رہ گئے۔"

وہ ایک کرسی کھینچ کر اطمینان سے بیٹھ گیا "ایسا ہوا کہ ایک بھاری بھرکم جسم کا آدمی خوب جیت رہا تھا۔ کارڈ اسے بڑا فیور کر رہا تھا۔ ایک بار کارڈ ڈیل ہونے سے پہلے ایاز کو نہ جانے کیا سوجھی اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تاشوں کی گڈی اپنے ہاتھ میں لی۔ اس میں سے چار تاش نکال کر جیب میں ڈال لئے اور بازیگروں کی طرح کھلاڑیوں سے کہنے لگا۔ دیکھئے ابھی میں اپنے جادو منتر کے زور سے یہ کارڈ آپ کی جیب سے نکالتا ہوں اور اس بھاری بھرکم جسم والے آدمی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاروں کارڈ نکال کر دکھائے۔" اس نے زور کا قہقہہ لگایا "آج تک کسی نے شارپر کو اس طرح نہ پکڑا ہو گا۔ وہ اس بات پر بگڑا تو ایاز نے اس کی ٹائی پکڑ کر وہ مکا مارا کہ کرسی سمیت فرش پر آ رہا۔ پھر تو سب ہی اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ مرمت ہوئی کہ بس کچھ پوچھو نہیں۔"

شاید پروفیسر کی نظروں میں وہ پورا منظر آ گیا تھا۔ وہ برابر ہنسے جا رہا تھا۔ میں نے اسے اس فراخ دلی سے ہنستے بہت کم دیکھا تھا۔

رات اب زیادہ ہو گئی تھی۔ لہٰذا وہ تھوڑی دیر بعد اوپر چلا گیا۔

اب پھر ایاز کا ذکر شروع ہو گیا تھا۔ کوئی بات ہوتی، کسی کا تذکرہ ہوتا وہ خواہ مخواہ گفتگو میں ایاز کو ضرور لے آتا۔ اکثر مجھے اس کے اس انداز پر جھنجھلاہٹ بھی معلوم ہوتی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں اپنا نیا سوٹ پہن کر کہیں جا رہا تھا۔ دروازہ پر پروفیسر سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ مسکرا کر بولا۔

"سوٹ تو تم نے بڑا شاندار سلوایا ہے۔ کپڑا بھی قیمتی معلوم ہوتا ہے۔" پھر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے بولا "لیکن کمر کے پاس جھول آ گیا ہے۔ اس عیب نے سوٹ کی وقعت گھٹا دی۔ اسی کپڑے کا میں نے ایاز کے پاس بھی ایک سوٹ دیکھا ہے۔ نہ جانے کس درزی سے سلوایا ہے، بڑی عمدہ فٹنگ ہے۔ اس کا جسم بھی خوب صورت ہے۔ پہن کر چلتا ہے تو بالکل رابرٹ ٹیلر معلوم ہوتا ہے۔"

ایاز میں لاکھ خوبیاں سہی مگر اس وقت اس کے ذکر کا موقع نہیں تھا۔

اسی طرح ایک روز میں بڑا قیمتی پرفیوم لے کر آیا۔ ایک دوست پیرس سے بطور خاص میرے لئے لایا تھا۔ پروفیسر اس کی دیر تک تعریف کرتا رہا۔ پھر نہ معلوم کیسے اسے دفعتاً ایاز کا خیال آ گیا۔ کہنے لگا "لیکن ایاز کے پاس میں نے جو پرفیوم دیکھے ہیں۔ ان کی مہک سے روح پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ خوشبوؤں کے انتخاب میں وہ بڑا نفاست پسند واقع ہوا ہے۔"

اس دفعہ بھی میں غصہ پی گیا۔ البتہ اس روز تو میں اس کے ریمارک پر بہت جھلا گیا تھا جب اس نے خواہ مخواہ ایاز کا ذکر چھیڑ دیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ والدہ نے خط کے ساتھ ایک لڑکی کی تصویر بھیجی تھی۔ اس کے ساتھ وہ میری نسبت طے کر رہی تھیں۔ لڑکی صورت شکل کی جیسی بھی ہو مگر فوٹو اس قدر غضب کا تھا کہ دیکھ کر آدمی خود تصویر بن جاتا تھا۔ شامتِ اعمال میں نے وہ تصویر پروفیسر کو بھی دکھا دی۔ ذرا دیر تک وہ اسے دیکھتا رہا، پھر مسکرا کر بولا "بہت خوب" وہ پھر بڑی محویت کے ساتھ تصویر دیکھنے لگا۔ اسے دیکھتے دیکھتے ناگاہ مڑ کر میری جانب متوجہ ہوا "تو گویا تمہارے لئے اسے منتخب کیا گیا ہے۔ واقعی بڑی حسین لڑکی ہے۔ کہیں ایاز کے ساتھ اس کا رشتہ ہو جائے تو دونوں کا مثالی جوڑا ہو۔"

کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ گیا۔ مگر معاملہ فہم اور جہاں دیدہ آدمی تھا فوراً ہی اسے غلطی کا احساس ہوا۔ گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ میں اس وقت غم و غصّے کے عالم میں تھا۔ وہ شرمسار ہو کر اظہار معذرت کرنے لگا۔

"بھئی برا نہ ماننا، میں نے تو یوں ہی بے خیالی میں یہ بات کہہ دی تھی۔" وہ صفائی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دیر تک اس لڑکی کے حسن کی تعریف کرتا رہا۔ مگر اس کی بات دل میں ایسی لگی کہ اداس اور دل گرفتہ ہو گیا تھا۔ مجھے کبیدہ خاطر دیکھ کر کہنے لگا "تم واقعی برا مان گئے۔ بڑے جذباتی ہو۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میری پیٹھ تھپک کر نرم لہجے میں گویا ہوا۔ "اچھا آؤ۔ میں تم کو بڑی دلچسپ چیز دکھاؤں۔"

اس کے ساتھ جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر اصرار کر کے وہ مجھے اپنی خواب گاہ میں لے گیا۔ اس نے اپنے سرھانے دیوار پر ایک مجسّے کو دکھایا۔ نہ جانے کس پتھر کا بنا ہوا تھا۔ جس کے اندر بجلی کا ایک بلب روشن تھا۔ وہ دیوار گیری کی طرح دیوار پر آویزاں تھا۔ مجسّے میں سے سبزی مائل نیلی نیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہ ایک عورت کا مجسمہ تھا۔ وہ رقص کے انداز میں کھڑی تھی۔ کچھ اس طرح کہ اس میں جھجک بھی تھی اور خود سپردگی بھی۔ اس کے بدن کا ایک ایک خم، ایک ایک لوچ نکھر گیا تھا۔ سنگ تراش نے اس فٹ بھر کے مجسمے میں صناعی کا کمال دکھایا تھا۔ میں دیر تک اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پروفیسر مجھے اس عالم میں دیکھ کر مسکرا دیا۔

"تم تو اسے دیکھ کر مسحور ہو گئے۔ چند ہی روز قبل میرے ایک دوست روم سے لائے تھے۔ بھئی اطالوی سنگ تراشی کی کیا بات ہے۔ میں نے اب تک تم کو اس لیے نہیں دکھایا تھا کہ تم اسے میرے کمرے میں دیکھ کر نہ جانے کیا سوچو گے۔"

نہ معلوم کیوں اسے اپنے سن رسیدہ ہونے کا اس قدر احساس تھا۔ بہرحال ہم دونوں کوئی گھنٹہ بھر تک صرف اس مجسمے کے موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ سنگ تراشی پر بات چلی تو اس نے اس انداز سے گفتگو کی کہ اس کے وسیع مطالعہ پر میں ششدر رہ گیا۔

لیکن اس کی فطرت کا نہ جانے یہ کون سا پہلو تھا کہ جب اس کا موڈ ہوتا تو کسی بھی موضوع پر بے تکان باتیں کرتا رہتا ورنہ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی سوال پوچھنے پر بھی اس طرح خاموش بیٹھا رہتا جیسے سنا ہی نہیں۔ یہی بات اس مجسمے کے سلسلے میں بھی ہوئی۔ دوسرے روز میں نے اس کا ذکر کیا تو

وہ چند جملے کہہ کر خاموش ہو گیا۔

اس مجسمے سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ میں نے چھیڑ کر پھر اس کا ذکر نکالا۔ وہ ٹالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اصرار کیا تو جھنجھلا کر اٹھا اور لائبریری میں چلا گیا۔ جب وہ کسی ذہنی پریشانی میں ہوتا تو ہمیشہ لائبریری میں جا کر پناہ لیتا تھا۔

دوسرے یا تیسرے روز کا ذکر ہے۔ میں رات کو دیر سے لوٹا۔ کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ دن بھر میں پروفیسر سے نہیں مل سکا تھا۔ اوپر کی منزل میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا ابھی نیند تو آئے گی نہیں، پروفیسر ہی کے ساتھ کچھ وقت گزر جائے تو اچھا ہے۔ زینے کی سیڑھیاں طے کر کے میں اس کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بجائے صوفہ کے گل دان رکھنے کے اونچے اسٹول پر بندر کی طرح سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ ماتھے پر سے خون بہہ کر رخسار پہ آ کر جم گیا تھا۔ بدن پر اور بھی کئی جگہ خراشیں تھیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج پھر یہاں کچھ ہنگامہ برپا ہوا ہے۔

وہ کچھ اس طرح بت بنا بیٹھا تھا کہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ ایک دفعہ اس نے مجھے دیکھا بھی مگر چپ بیٹھا رہا۔ میں بھی خاموش کھڑا رہا۔ آخر اس نے خود ہی کہا۔

"کھڑے کیوں ہو، بیٹھ جاؤ۔"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ "آپ کچھ پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔"

پروفیسر نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کھوئی کھوئی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ اسٹول پر سے اتر کر نیچے آ گیا۔ پھر اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے لیے ہوئے خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ سامنے مجسمے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا۔

"ایاز!" پھر میں نے جلدی سے پوچھا "کیا وہ آیا تھا؟"

"ہاں۔" اس نے جواب میں صرف ایک لفظ کہا۔

میں نے غصے سے تقریباً چیخ کر کہا "آخر وہ چاہتا کیا ہے؟"

"وہ کہتا ہے کہ جو لوگ پتھر کے مجسموں میں اپنی تسکین کا سامان ڈھونڈتے ہیں، وہ پتھر کی طرح سرد پڑ جاتے ہیں۔ یہ موت کی علامت ہے۔ وہ مجھے موت کے منہ میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا

لہذا اس نے مجسمہ توڑ دیا۔ میں نے اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی تو وہ وحشیوں کی طرح مجھ سے الجھ گیا۔ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔" وہ بڑے اطمینان سے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کر رہا تھا۔

مجھے اس کا یہ رویّہ بے حد ناگوار گزرا۔ میں نے جل کر کہا: "اس اُلّو کے پٹھے کو آپ نے خواہ مخواہ سر چڑھا لیا ہے۔"

میری بات پر برا ماننے کے بجائے وہ بے نیازی سے مسکرا کر بولا: "تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔" وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ میں بھی خاموش رہا۔ یکایک اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے تسلی دے کر چپ کرا دوں۔ مگر اس وقت رونا ہی اس کے حق میں مناسب تھا۔ وہ دکھ جو بہت دیر سے وہ اپنے سینے میں دبائے بیٹھا تھا، آنسوؤں کے ذریعہ تحلیل ہو کر نکل رہا تھا۔ کمرے کے گہرے سکوت میں اس کی سسکیاں دیر تک ابھرتی رہیں۔ سامنے فرش پر اس مجسمے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے جس کے وجود میں ایک حسینہ کے جسم کا لوچ تھا، پیچ و خم تھے اور جو اطالوی سنگتراشی کا ایک نادر نمونہ تھا۔ پروفیسر کا چہرہ مُردے کی طرح خاکستری ہو گیا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ اسی اثنا میں پروفیسر پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ اس نے اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے بھینچ لیا اور بوڑھوں کی طرح کھانسنے لگا۔

کھانسی سے جب ذرا سنبھلا تو مجھ سے کہنے لگا: "تم اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں تمہارا بہت ممنون ہوں گا۔" یہ بات اس نے کچھ ایسے کرب ناک لہجے میں کہی تھی کہ میرے لیے اب وہاں ٹھہرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔

میں چپ چاپ نیچے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ مگر بے چینی میں نیند نہ آ سکی۔ اوپر پروفیسر کے کمرے سے اب تک رک رک کر کھانسی ابھر رہی تھی۔ جب تک میں جاگتا رہا کھانسی برابر سنائی دیتی رہی۔ پتہ نہیں وہ کسی لمحہ سویا بھی یا ساری رات آنکھوں ہی میں کاٹ دی۔

میں نے ایاز کا اس قدر بے چینی سے کبھی انتظار نہیں کیا تھا۔ مگر اس رات کے واقعہ کے بعد سے تو بس ہر وقت یہی دھن سوار رہتی کہ کسی طرح وہ مل جائے تو اس طرح ذلیل و خوار کر کے نکالوں کہ

دوبارہ اس طرف کا رُخ نہ کرے۔ اسی ارادے کے تحت میں نے دفتر سے ہفتہ بھر کی چھٹی لے لی گھر سے نکلنا بھی بند کر دیا۔ ہر وقت بیٹھا بس ایاز کی راہ تکتا رہا۔ لیکن وہ بھول کر بھی اس طرف نہ آیا۔ پروفیسر کو تو یہ بات نہیں بتائی مگر ایاز کی اتنی طویل غیر حاضری سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اس رات دونوں میں سخت جھگڑا ہوا تھا۔

(۴)

پروفیسر سے ان دنوں کم ہی ملاقات ہوتی۔ اس کا بوڑھا ملازم اچانک بیمار پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ٹائی فائڈ بتایا تھا۔ پروفیسر سرگرمی سے اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔ خود ہی دوا پلاتا۔ اپنے ہاتھ سے اس کے لیے دودھ گرم کرتا۔ چونکہ دواؤں کا قحط تھا۔ لہٰذا دن بھر اس کے لیے دوائیں ڈھونڈتا پھرتا۔ رات کو سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دباتا۔ نیند سے اٹھ اٹھ کر اس کو پانی پلاتا۔ لیکن ملازم کی بیماری میں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹروں کے مشورے پر اسے سول اسپتال میں داخل کرا دیا۔ لیکن سہ پہر کو بلا ناغہ اسپتال جاتا اور رات گئے تک اس کے پاس رہتا۔ کوئی مہینہ بھر بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی۔

جس روز ملازم کو اسپتال سے واپس گھر لایا، اس روز اس کے چہرے پر بڑی اچھوتی چمک تھی۔ ایسی تازگی جو شبنم سے بھیگ کر پتوں پر آ جاتی ہے۔

بوڑھا ملازم تو اب صحت یاب ہو گیا تھا مگر اس کی بیماری پر نہ صرف ہم دونوں کی مہینہ بھر کی تنخواہیں صرف ہو گئی تھیں، بلکہ کچھ قرض بھی چڑھ گیا تھا اور یہ قرض خواہ اکثر آ کر پریشان کیا کرتے۔ دوسروں کو تو اس نے آئندہ ماہ پر ٹال دیا تھا مگر جس دکان سے راشن آتا تھا، وہ روزانہ کسی نہ کسی وقت بلائے بے درماں کی طرح نازل ہو جاتا۔

بڑی سرد رات تھی۔ یہی کوئی ساڑھے نو کا عمل ہوگا۔ لیکن سردی زیادہ تھی۔ لہٰذا سرِ شام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ باہر تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم دونوں کمرے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے آتش دان کے سامنے بیٹھے گرم گرم کافی پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ پروفیسر خوش گوار موڈ میں تھا۔ وہ اس وقت یونانی دیو مالا کے متعلق بڑی اچھی باتیں بتا رہا تھا۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی سردی میں آگ کے پاس سے اٹھ کر دروازے تک جانا ناگوار معلوم ہوا مگر یہ سوچ کر کھڑا ہو گیا کہ کہیں اس وقت ایاز نہ آیا ہو۔ دروازہ کھول کر دیکھا۔ اندھیرے میں کوئی خاموش کھڑا تھا۔ لیکن یہ تو وہی

بلائے بے درماں تھی۔ وہ جھٹ اندر آگیا اور سیدھا پروفیسر کے پاس پہنچا۔

"دیکھئے صاحب! آج ہمارا حساب صاف ہو جانا چاہیئے۔"

پروفیسر نے حسب معمول نرمی سے کہا "بھئی راشن تو تمہارے یہاں سے آ ہی رہا ہے۔ آئندہ اکٹھا حساب صاف کر دیں گے۔"

وہ بے رُخی سے بولا "نہیں صاحب اس طرح کام نہیں چلے گا۔ مجھے تو ابھی روپے کی ضرورت ہے۔"

پروفیسر نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا "شیخ جی! ایسی بات مت کہو۔ اس مہینے تم کسی طرح اپنا کام چلا لو۔ دوسرے مہینے جی چاہے تو تم مجھ سے کچھ زیادہ لے لینا۔"

وہ بڑی بدتمیزی سے بولا "اجی زیادہ تو آپ کیا دیں گے۔ جو نکلتا ہے وہی مل جائے تو بہت ہے۔"

پروفیسر بھی اب بے قابو ہوئے جا رہا تھا، بولا "خیر اس مہینے تو آپ کو کچھ نہیں مل سکے گا۔"

وہ آنکھیں نکال کر کہنے لگا "ملے گا کیسے نہیں۔ میں آج ہی سارا حساب لے کے جاؤں گا اور ابھی۔"

اتنا کہہ کر وہ آستین چڑھا کر کھڑا ہو گیا۔ بات بڑھ جاتی۔ پروفیسر کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا اسے کبھی غصہ آتا ہی نہیں اور جب آتا ہے تو وہ بے حد خطرناک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا میں نے فوراً مداخلت کی۔

"شیخ جی! تم کو اپنا روپیہ چاہیئے نا؟"

وہ ذرا نرم ہو کر بولا "جی ہاں۔"

میں نے کہا "ایک گھنٹہ بعد تم آ کر مجھ سے اپنا پورا حساب لے جانا۔"

وہ ایک دم رضامند ہو گیا "بہت اچھی بات ہے۔ میں دس بجے تک آ جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پروفیسر نے مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

"تم اس کمینے کی گیدڑ بھبکی سے ڈر گئے۔ ذرا تم رک تو جاتے۔ میں اس بدتمیزی کا وہ مزا چکھاتا کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔"

وہ بڑے جلال میں بول رہا تھا۔ میں نے ہڈیاں نکلے اس کے جسم کو دیکھا اور اس کے مقابلے میں موٹے تگڑے شیخ جی کے بارے میں غور کیا تو ہونٹوں پر ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ میں نے اس کی ہاں

میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"اس سے جھگڑا کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔"

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ کہنے لگا "یہی سوچ کر تو میں چپ رہا۔ ورنہ یہ مت سمجھنا کہ میں دبلا پتلا ہوں۔ ایک ٹکر مارتا تو مریل بیل کی طرح دھڑام سے فرش پر جا تا۔"

باتوں پر وقت صرف کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے نیچے جا کر کپڑے تبدیل کئے اور اس جاڑے پالے میں ایک دوست کے پاس پہنچا۔ اُسے اسی وقت جگا کر روپے قرض لیے اور واپس آیا۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پروفیسر، جسے میں جلے کباب کی طرح غصہ کے عالم میں چھوڑ گیا تھا، بڑے معنی خیز انداز میں بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"تم نے تاخیر کر دی۔ ذرا دیر پہلے آ جاتے تو تماشہ دیکھتے۔ الو کا پٹھا شیخ جی دس بجے سے پہلے ہی نازل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایاز بھی آ گیا۔ آتے ہی شیخ جی نے اسی بدتمیزی سے تقاضہ کیا۔ تم کو بھی برا بھلا کہنے لگا۔ میں جلا تو بیٹھا ہی تھا۔ مجھے بھی تاؤ آ گیا۔ مگر ایاز نے مجھے تو ایک طرف کر دیا اور اس کے منہ پر دو تین مکے جو رسید کئے تو شیخ جی کا سارا طنطنہ نکل گیا۔ لگا غیں غیں کرنے۔ ایاز اسے دروازے تک دھکے دیتا لے گیا اور نکال باہر کیا۔ شریف ہو گا تو اب کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔"

میں خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ دیر تک اس ہنگامے کی ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔ گیارہ بجے کے قریب میں اٹھ کر اپنے کمرہ میں آ گیا۔ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے اچانک مجھے خیال آیا کہ اس وقت تو ایاز نے شیخ جی کو مار پیٹ دیا لیکن وہ شورہ پشت قسم کا آدمی معلوم ہوتا ہے کالج جاتے ہوئے راستہ میں اگر اس نے پروفیسر کے خلاف انتقاماً کوئی کارروائی کی تو کیا ہو گا؟ جلا برا ہوتا ہے۔ وہ باز نہیں آئے گا۔ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔ کچھ یہی سوچ کر میں فوراً ہی شیخ جی کی طرف چل دیا۔ وہ ابھی سویا نہیں تھا۔ نکل کر باہر آیا۔ میں نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ ابھی آپ گھر گئے تھے۔ مجھے ذرا دیر ہو گئی۔ آپ کے ساتھ ایاز نے جو زیادتی کی ہے، وہ بہت بری بات ہوئی۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔"

وہ حیرت زدہ ہو کر بولا "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ کون ایاز؟ کس کا جھگڑا؟ میں گیا ہی کب تھا۔ پروفیسر صاحب یہاں خود آئے تھے۔ اپنی گھڑی دے گئے ہیں اور یہ کہہ گئے ہیں کہ چند ہی

روز میں روپے کا بندوبست کر کے گھڑی لے جائیں گے۔ وہ تو بے چارے کتنی دیر تک خوشامد کرتے رہے اور آپ جھگڑے کی بات کر رہے ہیں۔" وہ ایک سانس میں ساری باتیں کہہ گیا اور میں سکتے کے سے عالم میں بت بنا اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر میں نے جیب سے روپے نکالے اور اسے سمجھانے لگا۔

"وہ بھی ان کے ملازم نے تو مجھ سے یہی کہا تھا۔" میں نے پروفیسر کا تو نام لیا نہیں۔ سارا الزام نوکر پر رکھ دیا۔ "بہرحال آپ یہ روپے رکھ لیجیے۔ اور کل گھڑی پروفیسر کو واپس دے دیجیے گا۔ میرے یہاں آنے اور روپے ملنے کا ان سے کوئی تذکرہ نہیں کیجیے گا۔"

میں نے روپے اسے دیئے اور اچھی طرح سمجھا بجھا کر واپس آ گیا۔

پروفیسر کی اس غلط بیانی پر مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اس نے صرف ایاز کی توقیر بڑھانے کے لیے میرے سامنے یہ ڈھونگ رچایا تھا۔ دراصل ایک عرصے سے ایاز اس کے پاس آیا نہیں تھا اور اب وہ اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ سوچا ہو گا کہ اگر یوں سیدھے سادے طور پر ایاز کو منا کر لائے گا تو ممکن ہے کہ مجسمہ توڑنے والے واقعہ کے باعث میں اس سے لڑ بیٹھوں۔ لہٰذا اس نے پیش بندی کے طور پر یہ سب کچھ کیا تھا۔ بہرصورت یہ بات تو اب بخوبی واضح ہو گئی تھی کہ وہ ایاز سے زیادہ عرصہ تک قطع تعلق نہیں رکھ سکتا۔ وہ اس کی بہت بڑی کمزوری بن چکا تھا۔ اس کمزوری کے پس پردہ کیا راز پنہاں تھا اسے وہی بہتر جانتا ہو گا۔

دوسرے ہی روز سے پروفیسر نے پھر ایاز کی باتیں شروع کر دیں۔ لیکن وہ جس قدر اس کے ذکر میں لطف محسوس کرتا، مجھے اتنا ہی ناگوار معلوم ہوتا۔ البتہ مجھے ایاز سے ملنے، اسے دیکھنے اور اس سے بات چیت کرنے کا اشتیاق اور بڑھ گیا تھا۔ لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اس تمام عرصہ میں ایک بار بھی اس سے مڈبھیڑ نہ ہو سکی۔ اس کے اسباب دو ہی ہو سکتے تھے۔ یا تو پروفیسر مجھے ایاز سے ملانا نہیں چاہتا تھا یا پھر اس میں محض حادثات کو دخل تھا۔

(۵)

اس روز کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ طبیعت بھی سست تھی۔ میں دفتر بھی نہیں گیا تھا۔ تمام دن بستر پر پڑا رہا۔ شام کو جب پڑے پڑے الجھن ہونے لگی تو میں نے لباس تبدیل کیا اور باہر چلا گیا اس وقت بارش بند ہو چکی تھی۔ لیکن بادل گھرے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر کیچڑ تھی۔ لہٰذا کوچہ و بازار کے چکر

کاٹنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ فوراً ہی واپس جانے کا بھی ارادہ نہ تھا۔

سڑک کے ایک موڑ پر کھڑا میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا پروگرام بنایا جائے۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان میرے قریب سے گزرتے ہوئے ٹھٹکا۔ اس کی نظروں سے معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ آگے بڑھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ پھر پلٹا۔ اس دفعہ وہ میرے بالکل قریب آ گیا اور جھجکتے ہوئے بولا۔

"میں نے پروفیسر الیاس کے یہاں آپ کو اکثر دیکھا ہے"

میں نے فوراً جواب دیا "جی ہاں! میں ان کے ساتھ ہی رہتا ہوں"

وہ بے تکلفی سے مسکرا کر بولا "مہربانی فرما کر یہ کتابیں ان کو دے دیجیے گا۔ بادل گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے گھر آنے جانے میں بارش نے آ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

اتنا کہہ کر اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھ گیا۔ جب وہ کچھ دور چلا گیا تو اچانک میں نے سوچا یہ ایاز تو نہیں تھا؟ وہی ہو گا۔ وہ قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ جسم بھی صحت مند تھا۔ میں نے اس کا چہرہ غور سے نہیں دیکھا۔ وہ خوب صورت بھی ہو گا۔ بڑی کوفت ہوئی۔ اس وقت تو اس سے تفصیلی ملاقات ہو جاتی۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ سوچا کہ اگر مل جائے تو اصرار کر کے اسے کسی چائے خانے میں لے جاؤں گا۔ وقت بھی گزر جائے گا اور اس سے ملنے کا جو اشتیاق تھا وہ بھی پورا ہو جائے گا لیکن پوری سڑک چھان ڈالی۔ ہر راہ گیر کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا مگر وہ دوبارہ نظر نہ آیا۔ چھلاوے کی مانند آن کی آن میں اوجھل ہو گیا۔

واپس گھر پہنچا تو بہت تھک چکا تھا۔ لیکن ابھی میں کوٹ اتار کر ہینگر پر ٹانگنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اوپر کی منزل کا دروازہ بڑے زور سے کھلا۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر آ گیا۔ پروفیسر بدحواسی کے عالم میں لکڑی کے زینے پر سے دھم دھم کر کے اتر رہا تھا۔ اس وقت اس کا عجیب حلیہ تھا۔ بال بکھرے ہوئے۔ چہرے پر وحشت۔ ایک ہاتھ کوٹ کی آستین میں اور دوسرا باہر۔ میرے سامنے آیا تو تیکھے لہجے میں بولا۔

"تم نے اس حرام زادے کو تو نہیں دیکھا۔ ابھی کھڑکی پر سے کود کر بھاگا ہے۔"

یہ کہتا ہوا وہ گھر سے باہر نکلا۔ میں بھی گھبرا کر اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ اسی انداز سے بولتا

"آج اس نے وہ کمینہ پن کیا ہے کہ میں زندگی بھر اسے معاف نہیں کروں گا۔" اُس کے منہ سے کف جاری تھا۔ آواز غصہ سے لرز رہی تھی۔

"میں اُسے قتل کر دوں گا۔ آج میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

میں اور بھی گھبرا گیا۔ معلوم ہوتا ہے آج کوئی سنگین واردات ہو گئی۔ پروفیسر کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے قریب جا کر پوچھا۔

"پروفیسر صاحب آخر ہوا کیا؟ چلیئے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

وہ پلٹ کر مجھ پر برس پڑا۔ "جی نہیں! آپ میرے ساتھ کیوں جائیں گے؟"

میں نے اس کی بات کا برا نہیں مانا۔ رسان سے کہا۔ "آپ کا تنہا جانا مناسب نہیں۔"

"ایک بار میں نے کہہ دیا کہ آپ میرے ساتھ نہیں جا سکتے۔ یہ میرا نجی معاملہ ہے۔ آپ اس میں بولنے والے کون؟"

اس نے یہ بات اتنے زور سے چیخ کر کہی کہ راہ گیر ٹھٹک کر ہم دونوں کو دیکھنے لگے۔ میں نے سوچا کہ اب میں نے مزید کچھ کہا تو پروفیسر مجھ سے لڑ پڑے گا۔ وہ اس وقت سخت غیظ و غضب کے عالم میں تھا۔ لہٰذا میں بغیر کچھ کہے سنے کمرے میں واپس آ گیا۔

کچھ دیر اپنے کمرے میں ٹھہرنے کے بعد میں نے سوچا ذرا چل کر اوپر تو دیکھوں کہ آج کیا توڑ پھوڑ ہوئی ہے۔ لیکن جب میں وہاں گیا تو ہر چیز قرینہ سے اپنی جگہ موجود تھی۔ ابھی میں کھڑا متجسس نظروں سے کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اچانک ہلکی ہلکی سسکیاں سنائی دیں۔ لائبریری میں کوئی رو رہا تھا۔ میں لپک کر وہاں گیا۔ لائبریری میں اندھیرا تھا۔ آتشدان میں تھوڑے سے کوئلے دہک رہے تھے۔ ان کی دھندلی دھندلی روشنی میں دیوار کے پاس کوئی زمین پر پڑا ہوا نظر آیا۔

آہستہ آہستہ چلتا ہوا میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن میں نے زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا تھا کہ سسکیوں میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔

"خبردار جو میرے قریب آئے۔"

یہ تو عذرا تھی، شرمیلی سی سانولی سلونی لڑکی۔

تو کیا آج ایاز؟ پھر میں نے خود ہی اس خیال کی تردید بھی کر دی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ہی لمحے، میں نے سوچا نہیں ایسا ہی ہو گا۔ ورنہ پروفیسر غصہ سے اتنا پاگل نہ بن جاتا۔

میں نے فوراً ہی سوئچ دبا کر کمرے میں روشنی کی۔ عذرا فوراً اٹھی اور دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ گھٹنوں پر چہرہ رکھے سسکیاں بھر کر رو رہی تھی۔ میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو سراسر درندگی ہے۔"

وہ اسی طرح سسکیاں بھر کر روتی رہی۔

میں نے لمحہ بھر رک کر پھر کہا۔ "اگر مجھے سور کا بچہ ایاز مل جائے تو میں اس کا خون پی لوں گا۔ ایک کمزور لڑکی پر یہ ظلم کرتے ہوئے اس کمینے کو ذرا بھی غیرت نہ آئی۔"

اس نے اس دفعہ گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

"کون ایاز؟"

میں چکر میں پڑ گیا۔ معاً میری زبان سے نکلا۔ "تو کیا پروفیسر؟" میں جملہ پورا نہ کر سکا۔

اس نے بڑے اطمینان سے کہا "ہاں" اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

حیرت و استعجاب کا مجھ پر ایسا اچانک حملہ ہوا کہ میں لڑکھڑا کر رہ گیا۔

آتش دان میں سلگتے ہوئے کوئلے اب بجھ چکے تھے۔ عذرا کی سسکیاں مدھم پڑ چکی تھیں۔ بادل زور زور سے گرجنے لگے تھے۔ بارش شروع ہونے والی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور گھر واپس جانے پر آمادہ کیا۔

باہر آ کر میں نے ٹیکسی لی اور عذرا کو اس کے گھر چھوڑ آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے اپنی اس حالت کے متعلق گھر پر کیا بتایا۔ یوں میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ ایکسی ڈنٹ کا بہانہ بنا کر وہ گھر والوں کو مطمئن کر سکتی ہے۔ ویسے وہ خاصی سمجھ دار لڑکی تھی۔ کوئی اور بہتر عذر بھی پیش کر سکتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے پروفیسر کے متعلق کچھ نہیں کہا ہو گا۔ اس لیے کہ اس نے صرف اس کے کپڑے نوچ ڈالے تھے یا چہرہ پر اس کے ناخنوں کی ایک آدھ خراش تھی۔ یہ سب کچھ بالکل اچانک ہوا تھا۔ اسی وقت عذرا کی چیخ نکل گئی اور وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ اس سانولی سلونی لڑکی نے مجھ سے یہی بتایا تھا۔

گھر واپس آکر میں نے دیکھا۔ پروفیسر ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ میں اوپر جا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ دیر تک انتظار کرتا رہا۔ آدھی رات گزر گئی۔ ایک بجا، ڈیڑھ بجا، پھر دو۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کھڑکی کے پٹ بار بار جھکڑ سے کھڑکھڑاتے۔ کمرے کا ماحول آسیب زدہ سا معلوم ہو رہا تھا۔

اس وقت نہ میں عذرا کے متعلق غور کر رہا تھا نہ ایاز کے متعلق۔ مجھے صرف یہ فکر تھی کہ پروفیسر اب تک واپس کیوں نہیں آیا۔ جس وقت دیوار پر لگے ہوئے گھڑیال نے دو بجائے تو بارش اور طوفانی ہواؤں کے ملے جلے شور میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے سرگوشی کی "پروفیسر مر گیا۔ اس نے خودکشی کر لی۔" پھر جیسے ہواؤں کی چیخوں میں، بارش کی بوندوں کے جل ترنگ میں، دریچوں کی کھڑکھڑاہٹ میں، یہی صدا بار بار ابھرنے لگی۔

"پروفیسر مر گیا!"

"اس نے خودکشی کر لی!"

"پروفیسر . . . . . . "

میرا جی چاہا کہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جاؤں۔

اسی وقت میں نے سنا۔ کوئی باہر زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے دیکھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں صرف دروازہ پر کھڑی ہوئی ٹیکسی دیکھ سکا۔

میں نے نیچے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے پروفیسر پانی میں شرابور کھڑا تھا۔ وہ اندر آیا تو میں نے دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک دبلی پتلی کرسچین لڑکی بھی تھی، وہ بھی بری طرح بھیگی ہوئی تھی۔

پروفیسر نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ اوپر گیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ بری طرح نشہ میں دھت تھا۔

کمرے میں پہنچتے ہی اس نے جیب سے بوتل نکالی۔ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھا۔ دو گلاس اٹھائے۔ اُن میں شراب انڈیلی۔ اپنا گلاس تو ایک ہی سانس میں اس نے خالی کر دیا۔ دوسرا گلاس اس لڑکی کے ہونٹوں سے لگا کر بولا "بار برا ڈارلنگ! پیو، کم آن۔" اس کی آواز اس وقت پھٹے ہوئے بانس کی طرح بھونڈی معلوم ہو رہی تھی۔ جب وہ گلاس اپنے ہاتھ میں

لے کر گھونٹ بھرنے لگی تو وہ بڑبڑانے لگا۔

"کپڑے؟ کپڑے تو بھیگ گئے۔ کوئی بات نہیں۔"

اس نے دیکھتے ہی دیکھتے سارے کپڑے اتار ڈالے اور بالکل برہنہ ہو گیا۔ میں ہکا بکا کھڑا تھا۔ اسے اس عالم میں دیکھ کر چونکا۔ اب وہاں ٹھہرنا قطعی مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا سوچا کہ اس کی نظر ذرا اِدھر اُدھر ہو تو اور میں چپکے سے زینہ کے دروازے پر پہنچ جاؤں۔

پروفیسر اس لڑکی کے سر ہو رہا تھا کہ وہ بھی کپڑے علیحدہ کر دے۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا۔ مگر بے بسی سے میری جانب دیکھنے لگی۔ پروفیسر نے بھی گھور کر میری جانب دیکھا اور جھوم کر بولا۔

"تم کون ہو جی، کون ہو؟ بولو" پھر وہ اس لڑکی سے پوچھنے لگا "یہ کون ہے؟ تم بتاؤ۔"

میں نہ جانے کیوں حماقت میں بول پڑا، "پروفیسر صاحب! میں ہوں شمیر۔"

وہ غضب ناک ہو کر چیخا "پروفیسر! کون پروفیسر؟ میں تو ایاز ہوں۔ پروفیسر سالا تو لائبریری میں کتابوں پر پڑا سوتا ہو گا۔ مگر اُلو کے پٹھے! تم نے مجھے پروفیسر کیوں کہا۔ ایاز کیوں نہیں کہتے۔" وہ بری طرح بہک رہا تھا۔ میں باہر جانے کے لیے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ وہ پھر چلّایا "حرام زادے، اُلو کے پٹھے" اور اس کے ساتھ ہی اس نے میرے منہ پر شراب سے بھرا ہوا گلاس زور سے مارا۔

یہ جو میری پیشانی پر صلیب کا سا نشان نظر آ رہا ہے۔ یہ اسی زخم کا نشان ہے۔ اب چلتے چلتے یہ بھی بتا دوں کہ دوسرے روز میں نے سویرے جا کر دیکھا تو پروفیسر لائبریری میں کتابوں پر سر رکھے بے خبر سو رہا تھا۔ وہ اس وقت بالکل مادر زاد برہنہ تھا۔

دیوار کے پیچھے

اچانک میری آنکھ کھل گئی. کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا عمل ہوگا. کہیں قریب ہی کتے زور، زور سے بھونک رہے تھے. ان دنوں پاس پڑوس میں چوری کی ایک آدھ واردات بھی ہو چکی تھی لہٰذا کتوں کے اس طرح مسلسل بھونکنے سے ذرا تشویش ہوئی. میں شہر کے جس علاقے میں رہتا ہوں۔ وہ کسی قدر غیر آباد ہے۔ نہ سڑکوں پر روشنی کا بندوبست ہے اور نہ رات کو پولیس کے گشت کا۔

آنکھ کھلنے کے بعد سوچا کہ احتیاطاً اپنے گھر کا بھی جائزہ لے لوں۔ میں نے دروازہ کھولا اور کھنکارتا ہوا باہر آگیا۔ گلابی جاڑوں کی رات تھی۔ ہوا میں خوشگوار خنکی تھی. کتوں کے بھونکنے کی آواز گھر کے پچھواڑے سے آرہی تھی۔ میں اسی طرف چل دیا. میرے مکان کے پیچھے ایک خالی پلاٹ ہے اور اس کے برابر ایک نیم تعمیر مکان ہے، جو غیر آباد ہونے کے باعث رات کی تاریکی میں بھوتوں کا مسکن معلوم ہوتا ہے۔ راتوں کو یہاں کتے بسیرا کرتے ہیں یا زیر تعمیر مکانوں پر کام کرنے والے مزدور اور کاریگر اسے حوائج ضروری کے لئے استعمال کرتے ہیں. معلوم نہیں کس منحوس کا مکان ہے، کبھی پلٹ کر اِدھر کا رخ نہیں کیا کہ اس سے احتجاج کر سکوں۔

ہاں تو جب میں عقبی دیوار کے قریب پہنچا تو پیچھے سے ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ میں لرز کر رہ گیا۔ دل میں کہا، لو بھئی، آج ہو گیا چوروں سے مچیٹا. قبل اس کے کہ میں لپک کر کسی کو بیدار کروں اسی اثنا میں چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک سنائی دی. ساتھ ہی کسی عورت نے بہت آہستہ سے کہا.

"یہ کتے تو ہمارے پیچھے لگ گئے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ آؤ اس خالی مکان میں چلیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" آواز مردانہ تھی۔

معاملے کی نوعیت تو کچھ سمجھ میں آگئی مگر میں چکّر میں پڑ گیا کہ اس وقت آدھی رات کو یہاں کون ہو سکتا ہے۔ کچھ غصہ بھی آیا کہ حرامزادوں کو کہیں اور ٹھکانہ نہ ملا، میری ہی دیوار کے پیچھے اُن کو عشق لڑانا رہ گیا تھا۔ جی چاہا کہ ان کو ٹوکوں، لعنت ملامت کروں، پھر اس خیال سے باز رہا کہ اپنی بھی نیند حرام ہوگی اور دوسروں کی بھی۔ خواہ مخواہ کا ہنگامہ ہوگا، بات زیادہ بڑھ گئی تو معاملہ پولیس تک پہنچے گا۔ سوچا مجھے کیا نقصان پہنچا رہے ہیں پسِ دیوار بیٹھے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں۔ میں خاموشی کے ساتھ واپس آکر بستر پر سو گیا۔

ابھی ذرا آنکھ لگی ہی تھی کہ بیوی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

گھبرا کر پوچھا "خیریت تو ہے؟"

جواب ملا "باہر سارا محلہ اکٹھا ہے، کوئی واردات ہو گئی ہے۔"

لوگوں کے زور، زور سے باتیں کرنے کی آوازیں بھی میں نے سنیں۔ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا. باہر جا کر دیکھا تو ایک مکان کے سامنے کچھ لوگ جمع تھے. قریب گیا تو ایک مرد اور عورت پر نظر پڑی۔ دونوں گردنیں جھکائے، سہمے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ بات کیا ہے. عورت سیاہ برقع پہنے ہوئے تھی۔ چہرے پر نقاب پڑی تھی۔ مرد صورت شکل سے ہرگز نامعقول نہیں لگتا تھا۔ سیاہ رنگ کی چست پتلون اور اونی سوئیٹر پہنے۔ وہ سیدھا سادا ایک عام نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ لوگ ان دونوں کے گرد نیم دائرے میں کھڑے اس طرح گھور رہے تھے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہوں۔

میری طرح کچھ اور لوگ بھی گھروں سے نکل کر وہاں آگئے۔ ہر آنے والے کی زبان پر ایک ہی سوال ہوتا "بھئی ہوا کیا، معاملہ کیا ہے؟" جواب دینے والا بھی ایک ہی شخص تھا. لمبا تڑنگا، نیلی یونیفارم پہنے، گلوبند لپیٹے۔ وہ بڑی شان سے اکڑا ہوا کھڑا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ یا در با فرس میں مستری کا کام کرتا ہے۔ ممکن ہے فورمین ہو۔ کچھ بھی ہو، بہرحال آدمی پرلے درجے کا شیخی خورہ تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر چٹخارہ لے کر اونچی آواز سے بتا رہا تھا۔

"بھئی ہوا یہ کہ میں ڈیوٹی ختم کرکے آرہا تھا۔ جب اس خالی مکان کے سامنے پہنچا تو کچھ آہٹ معلوم ہوئی، دو سائے ہلتے ہوئے نظر آئے۔ میں ٹھٹھک گیا اور وہیں سے ڈپٹ کر آواز لگائی، کون ہے؟ بس ایک دم یہ دونوں نکل کر بھاگے۔ میں پیچھا نہ کرتا تو صاف نکل گئے تھے. بلکہ یہ سالا تو

نکل ہی گیا تھا وہ تو راستے میں کوئی گڑھا آگیا۔ قلابازی کھا کر گرا اور میں نے فوراً دبوچ لیا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر میں نے ٹینٹوا گھٹنے سے دبا رکھا تھا۔ نکل کیسے جاتا۔"

یہ تفصیل وہ اس سے پہلے بھی بتا چکا تھا اور ہر بار کندھے اُچکا کر سب کو اس طرح دیکھتا جیسے ابھی اکھاڑے سے کشتی مار کر آیا ہے۔ وہ بات ختم کرتا تو ایک دم تبصرہ شروع ہو جاتا۔

"یارو اندھیر ہے اندھیر۔ غضب خدا کا کس قدر بے غیرتی ہے۔"

"صورت تو دیکھو، اچھا خاصا بھلا آدمی لگتا ہے اور اس کے یہ کرتوت۔"

"بھگا کر لایا ہے۔"

"نہیں بھئی، یہ تو کوئی آوارہ عورت معلوم ہوتی ہے۔"

"ابے تم کو یہ حرامکاری کرتے شرم نہیں آتی۔ جہنم میں جاؤ گے جہنم میں۔"

"تف ہے تمہاری اوقات پر۔"

اس لعنت اور پھٹکار کے دوران پستہ قد محمد حسین بھی اپنی منمنی آواز میں بار بار کہتے: "اجی ان کو سنگسار کر دینا چاہیئے۔ اسلام میں زناکاروں کی یہی سزا ہے۔"

جب وہ کئی بار یہی بات کہہ چکے تو ایک بار میں نے جل کر کہا: "قبلہ پہلا پتھر کون مارے گا۔" بولے "آپ ہی سے بسم اللہ ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔"

میں نے کہا: "جناب پھانسی کے تختے پر چڑھنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ زیادہ مجاہد معلوم ہوتے ہیں آپ ہی سے پہل ہو۔"

وہ ایک دم جوش میں آگئے "لیجیئے میں ہی شروع کرتا ہوں۔" اور انھوں نے واقعی پتھر بھی اُٹھا لیا۔

میں نے ٹوکا: "پتھر اُٹھانے سے پہلے یہ بھی سوچ لیجیئے کہ انجام کیا ہوگا، جیل کی کوٹھری اور پھانسی کا تختہ، بیوی رانڈ بیوہ، بچے یتیم۔"

انھوں نے فوراً پتھر چھوڑ دیا۔ مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولے: "ذرا زبان سنبھال کر بات کیجیئے۔ آپ ہی کے لیسے بزدلوں نے تو مسلمانوں کو بدنام کیا ہے جبھی تو ہم اس حالت کو پہنچے ہیں کہ اس طرح کھلے عام حرامکاری ہو رہی ہے۔"

شاید وہ کچھ اور بھی کہتے۔ لیکن بیچ میں دوسرے لوگ بول پڑے۔ ہر بھی یہی رہا تھا۔ کوئی بات شروع کرتا، دوسرا بیچ میں ٹانگ اڑا دیتا۔ ہر شخص اپنی ہانک رہا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اور وہ دونوں خاموش کھڑے تھے۔ خوف سے سہمے ہوئے، سکڑے ہوئے، دبکے ہوئے۔

رات ڈھلنے لگی تھی، خنکی بڑھ گئی تھی اور ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا تھا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ کچھ لوگوں کا اصرار تھا کہ دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے مگر سوال کئی میل دور تھانے تک جانے کا تھا۔ اور اس سے ہر شخص کنّی کاٹ رہا تھا۔ بعض کی تجویز تھی کہ مرد کا منہ کالا کیا جائے اور جوتے لگائے جائیں۔ عورت کی صرف چوٹی کاٹ دی جائے۔ کچھ اوروں نے بھی ایسی ہی عبرت ناک سزائیں تجویز کیں۔ بوڑھے بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے اور جوان بڑوں کے ڈر سے خاموش تھے۔ ایک آدھ بار انھوں نے لقمہ دیا تو ڈانٹ کر خاموش کر دیا گیا۔ جن کے باپ موجود تھے انھوں نے لڑکوں کو تنبیہہ کر کے گھر واپس بھیج دیا تھا۔

آخر بڑی بک بک جھک جھک کے بعد یہ طے پایا کہ ان سے پوچھ گچھ کی جائے اور اس تفتیش کی روشنی میں سزا تجویز کی جائے۔ لیکن اس طرح شبنم میں لوگ زیادہ دیر کھڑے رہنے کے حق میں نہیں تھے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ کہیں بیٹھ کر اطمینان سے پوچھ گچھ کی جائے۔ بات معقول تھی۔ سب تیار ہو گئے۔ لطف یہ کہ کوئی بھی گھر واپس جاتا معلوم نہیں ہوتا تھا ہر شخص کو دلچسپی تھی کرید تھی اور ان میں، میں بھی شامل تھا۔

یہ تحریک چونکہ اکبر صاحب کی تھی لہٰذا ان ہی کے مکان میں، جو قریب ہی تھا، بیرونی برآمدے میں سب لوگ اکٹھا ہو گئے۔ اندر سے کرسیاں آگئیں۔ بیٹھنا نصیب ہوا تو لوگوں میں کچھ معقولیت بھی پیدا ہوئی۔ عورت کو ذرا دور ایک کونے میں بٹھا دیا گیا اور مرد سے سوالات کئے جانے لگے۔ محلے کے واحد ڈاکٹر مرزا صاحب نے ابتدا کی۔ انھوں نے کسی قدر نرمی سے پوچھا۔

"بھئی تم اس محلّے کے تو معلوم نہیں ہوتے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے، کہاں رہتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ اور یہ عورت کون ہے؟ بیوی تو معلوم نہیں ہوتی۔"

کسی نے بیچ میں لقمہ دیا: "توبہ کیجیئے۔ بیوی کے ساتھ کوئی یہ نامعقول حرکت کرتا ہے۔" یہ صاحب کہ جن کا نامِ نامی اسمِ گرامی شریف احمد ہے۔ میرے گھر سے کچھ ہی فاصلے پہ رہتے ہیں۔ انھوں نے

ابھی نیا مکان تعمیر کرایا ہے۔ کسی ایسی فرم میں ملازم ہیں جہاں دوسرے الاؤنسوں کے ساتھ مکان کا ایک مقررہ کرایہ بھی ملتا ہے۔ اپنے مکان میں رہنے کے باوجود دفتر سے اس کا کرایہ بھی وصول کرتے ہیں۔ مکان بیوی کے نام ہے۔ اس خوف سے کہ راز نہ کھل جائے۔ بیوی کے نئے شوہر کے خانے میں کسی چھکن خاں کا نام لکھوا دیا ہے۔ ویسے بڑے پرہیزگار آدمی ہیں۔ میں ہر روز ان کو پابندی کے ساتھ مسجد کی جانب جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

شریف احمد کا ذکر تو خواہ مخواہ بیچ میں آگیا۔ اب اس آدمی کا حال سنیے۔ اس نے کسی سوال پر کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ بہت اصرار کیا گیا تو عاجزی سے بولا "جناب غلطی ہوگئی۔ معاف کر دیجیے۔ آپ سب سے معافی مانگتا ہوں، توبہ کرتا ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

مستری جی، جنہوں نے دونوں کو پکڑا تھا، فوراً بول پڑے "معافی تو تم نے اسی وقت مجھ سے مانگی تھی، اس طرح کام نہیں چلے گا۔ صاف صاف بتاؤ۔"

وہ آدمی پھر خاموش ہوگیا، کوئی جواب نہیں دیا، اچانک فیاض نے اٹھ کر اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ لگایا اور گرج کر بولے "بتاتا ہے کہ سالے کے ایک اور لگاؤں۔"

وہ آبدیدہ ہو کر بولا "آپ مار کیوں رہے ہیں۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔"

فیاض خان پولیس کے ریٹائرڈ انسپکٹر ہیں۔ ذرا نہ پسیجے۔ ایک اور ہاتھ رسید کیا۔ وہ بلبلا کر بولا "مارئیے نہیں۔ سب بتائے دیتا ہوں" اور اپنا گال سہلانے لگا۔

فیاض خاں نے ہم سب کو اس طرح داد طلب نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں کہ دیکھو اس طرح پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایکبار پھر اپنا سوال دہرایا "اب تو بتا دو کہ تم کون ہو، یہاں کیسے آئے، کیوں آئے؟"

فیاض خاں نے اس کو پھر ڈانٹا "سچ سچ بتانا ورنہ مار مار کر سور بنا دوں گا۔"

وہ آدمی آہستہ سے بولا "میرا نام اسلم ہے، دفتر میں کلرک ہوں۔"

پوچھا گیا "شادی ہوگئی ہے تمہاری؟"

اس نے انکار میں گردن ہلا دی۔

اکبر صاحب نے کہا "بھلے آدمی شادی کر کے گھر کیوں نہیں بسا لیتے، اس خرافات میں کیا رکھا ہے۔ عاقبت بھی خراب اور دنیا میں بھی منہ کالا۔"

وہ بولا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میری ماں اور دوسرے رشتہ دار بھی یہی کہتے ہیں مگر بات یہ ہے ....."

کسی نے بیچ میں بات کاٹ دی "کیوں بکتا ہے۔ تجھ کو تو عورتوں کے ساتھ آوارہ گردی میں مزا آتا ہے۔"

وہ کہنے لگا "نہیں جناب یہ بات نہیں۔"

فیاض خاں نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا "پھر کیا بات ہے، سچ سچ بتا۔"

وہ بتانے لگا "دیکھیے ڈیڑھ سو تو کل میری تنخواہ ہے، اس میں سے پچاس روپے ہر مہینے ماں کو بھیجتا ہوں۔ ان کا اور سہارا نہیں۔ باپ کا میرے انتقال ہو چکا ہے، آپ جانتے ہیں کراچی میں معمولی سے معمولی مکان سو روپے سے کم میں نہیں ملتا۔ ایک دوست کے ساتھ کسی نہ کسی طرح گزر بسر کر رہا ہوں۔"

پھر کوئی بیچ میں بول پڑا "اماں، صاف جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ تو کچھ اور ہی معاملہ لگتا ہے۔"

پوچھا گیا "اس عورت کو بھگا کر لائے ہو؟"

اس نے جواب دیا "جی نہیں۔"

کسی نے لقمہ دیا "تو پھر اس کا بھڑوا ہوگا۔" اس پر بعض لوگوں کی باچھیں کھل گئیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا "یہ عورت کون ہے؟"

وہ بڑے اطمینان سے بولا "معلوم نہیں۔"

فیاض خاں پھر گرجے "ابے پھر جھوٹ بولا۔ لگاؤں دو ایک اور؟"

"میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں۔"

فیاض خاں کو اب تو جلال آگیا۔ قبل اس کے وہ ہاتھ اٹھائیں ڈاکٹر صاحب فوراً بول پڑے "مگر بھئی، پھر یہ عورت تمہارے ساتھ یہاں کیسے آئی؟ ٹھیک ٹھیک بتاؤ ورنہ اور درگت بنے گی۔"

وہ کہنے لگا "دیکھیے بات یہ ہے کہ میں دس بجے کے قریب ایک دوست سے ملنے

ریلوے اسٹیشن گیا تھا۔ وہ ریلوے میں کام کرتا ہے۔ وہیں یہ عورت مجھ کو مل گئی۔ اسٹیشن سے ذرا ہٹ کر نٹ پاتھ پر کھڑی کسی آدمی سے بات کر رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ آدمی ایک دم آگے بڑھ گیا۔ میں اس کے پاس سے گزرا تو مجھے محسوس ہوا کہ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی تھی۔ میں آگے چلا گیا۔ پھر نہ جانے کیوں واپس آگیا۔"

کسی نے آوازہ کسا: "استاد یہ نہیں کہتے کہ ذرا ٹھرک لگانے کو جی چاہا تھا۔"

دوسری طرف سے آواز آئی: "اماں بات تو پوری سننے دو۔ ہاں بھئی تو پھر کیا ہوا؟" اب اس کی بات میں لوگوں کو دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔

وہ بتانے لگا: "میں نے قریب جا کر پوچھا کہاں جاؤ گی؟ بولی جہاں لے چلو، بس پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اس نے مجھ سے چالیس روپے مانگے اور بیس روپے پیشگی بھی لے لئے۔ ہم دیر تک سڑکوں پر ادھر اُدھر گھومتے رہے اور جب ایک پولیس والے کو اپنی جانب گھورتے دیکھا۔ تو سوچا کہ اس طرح سڑکوں پر گھومنا خطرناک ہے۔ میں نے فوراً ایک رکشا ٹھہرائی اور دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ مگر اس کو لے کر جاتا کہاں، دفتر کے ایک ملنے والے کے ہاں پہنچا تو اس نے گالیاں دے کر بھگا دیا۔ جس شخص کے ساتھ رہتا ہوں وہ بال بچے دار آدمی ہے۔ اس کو ذرا بھی شبہ ہو جائے تو کھڑے کھڑے گھر سے نکال دے۔"

سب بڑی دلچسپی کے ساتھ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اچانک اکبر صاحب بول پڑے: "جب منہ ہی کالا کرنا تھا تو کسی ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لے لیا ہوتا، ایسے ہوٹلوں کی کمی نہیں۔"

وہ بولا: "میرے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔"

کسی نے پوچھا: "کتنے روپے تھے؟"

"پچاس۔" اس نے بتایا۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "یہ ماں کو بھیجنے کے لئے تو نہیں تھے؟"

اس نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا: "جی ہاں!"

"بھئی حد ہو گئی۔"

"لعنت ہے اس شخص پر۔"

"اس کو تو واقعی سزا ملنی چاہیئے۔"

کسی نے اونچی آواز سے اس کو مخاطب کیا: "بھئی تم آگے بتاؤ۔"

وہ بتانے لگا: "جب کوئی جگہ سمجھ میں نہیں آئی تو ہم شہر سے نکل کر ادھر آ گئے۔ یہاں آبادی بھی کم ہے اور سڑکوں پر اندھیرا بھی ہے۔ کیا کرتا بیس روپے تو وصول کرنا ہی تھے۔" وہ اب ذرا کھل کر بات کرنے لگا تھا۔

کسی نے برجستہ کہا: "تو تم نے کئے وہ روپے وصول؟"

وہ بڑی معصومیت سے بولا: "رکشا کے کرائے میں جو تین روپے دیئے تھے وہ بھی وصول نہیں ہوئے۔"

پستہ قد محمد حسین اس بات پر تڑپ کر رہ گئے۔ بگڑ کر بولے: "لاحول ولا قوۃ، کیا بے غیرتی کی باتیں ہو رہی ہیں اور اس بے حیا کو تو دیکھیے کس بے شرمی کے ساتھ بات کر رہا ہے۔"

کچھ اور لوگوں نے بھی لعنت ملامت شروع کر دی۔

رات بہت زیادہ ہو چکی تھی اور اس شخص کی بات میں بھی اب کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے سفارش کی: "میرا خیال ہے اب ان کو جانے دیا جائے، خاصی سزا مل گئی۔"

شریف احمد کہنے لگے: "کیا بات کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ ان کو سزا کہاں ملی، ان کو ضرور کچھ نہ کچھ سزا ملنا چاہیئے تاکہ آئندہ عبرت ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: "یہ رسوائی، یہ لعنت پھٹکار کچھ کم سزا ہے۔ بھلے آدمی ہوں گے تو آئندہ ایسی حرکت نہیں کریں گے۔"

کسی نے اصرار کیا: "نہیں صاحب ان کو پولس کے حوالے کرنا چاہیئے۔"

ڈاکٹر صاحب نے پھر بھی ہتھیار نہیں ڈالے، کہنے لگے: "پولس کے حوالے کرنے سے کیا ہوگا، زیادہ سے زیادہ کچھ جرمانہ ہو جائے گا اور اخباروں میں خبر چھپ جائے گی کہ ایک نوجوان مرد اور عورت شارع عام پر بوس و کنار کرتے ہوئے پکڑے گئے اور جہاں تک تھانے جانے کا سوال ہے تو جناب میں تو اب گھر جا کر سوؤں گا۔ میں تھانے وانے نہیں جاتا۔"

ذرا دیر کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر شریف احمد کی آواز ابھری: "مجھے تو سب سے بڑا اعتراض

یہ سب ہے کہ یہ شریف لوگوں کی آبادی ہے۔ یہ یہاں اس حرامکاری کے لئے کیوں آئے؟"

میں، جو تمام عرصے خاموش بیٹھا رہا تھا، شامت اعمال بیچ میں بول پڑا: "جناب میرے گھر کی دیوار کے پیچھے یہ ساری بیہودگی ہوئی مگر میں اب ان سے کیا کہوں۔ نہ جانے رات کی تاریکی میں کس کس دیوار کے پیچھے کیا کچھ ہوتا ہے۔ مجھے تو انھوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ نہ میری نیند خراب کی۔ نہ میرے گھر میں نقب لگائی۔"

شریف احمد میری باتوں پر چڑ گئے۔ کہنے لگے: "آپ کو ان سے بڑی ہمدردی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ہی ہمدردی ہے تو اپنے گھر کے اندر بلایا ہوتا آپ نے۔" ان کی اس بات پر میں جل کر رہ گیا لیکن انھوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا۔ بڑے طنز کے ساتھ بولے: "آئندہ بلا لیجیے گا۔ ویسے یہ دھندا برا نہیں، منافع ہی منافع ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے زور کا ٹھٹھا مارا۔ میں نے اپنا پیر ڈھیلا کیا اور قبل اس کے کہ ان کا قہقہہ ختم ہو، جوتا اتار کے بغیر کسی تمہید کے تڑاتڑ دو ان کی گنجی چندیا پر جما دیئے۔ تیسرا ہاتھ اٹھایا تھا کہ لوگوں نے ہاتھ پکڑ لیا اور زبردستی جوتا چھین کر پھینک دیا۔ پھر کیا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کبھی وہ مجھ کو مارنے کے لئے جھپٹتے، کبھی میں ان پر لپکتا۔ کئی بار ہم گتھم گتھا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ہر بار لوگوں نے روک لیا۔ اچھی خاصی افراتفری مچ گئی۔

جب ذرا معاملہ ٹھنڈا ہوا تو پتہ چلا کہ اس ہنگامے میں وہ دونوں چپکے سے نکل بھاگے مگر میں بیٹھے بٹھائے مشکل میں پھنس گیا۔ شریف احمد نے دوسرے ہی دن سٹی کورٹ میں مجسٹریٹ کے روبرو حاضر آ کے اسٹامپ پر حلف نامہ داخل کیا۔ دو گواہ پیش کئے اور مار پیٹ کرنے کے الزام میں میرے خلاف قابلِ ضمانت وارنٹ جاری کرا دیئے۔ ابھی مقدمے کی پہلی پیشی ہوئی ہے جس میں ضمانت دے کر آیا ہوں۔ باقاعدہ سماعت بعد میں ہوگی۔ اب چونکہ یہ معاملہ عدالت کے روبرو ہے۔ لہٰذا یہ بات یہیں چھوڑے دیتا ہوں۔ کچھ اور کہوں گا تو توہینِ عدالت کے جرم میں دھر لیا جاؤں گا۔